

غالب بُرا نہ مان



ریاض صدیقی



PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081



پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

غالب برانہ مان

ریاض صدیقی

اسری پبلی کیشنز کراچی

انتساب

ڈاکٹر وزیر آغا
کے نام

بُجلہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	غالب بُجراد مان
سن اشاعت	جولائی ۱۹۹۲ء
طبعات: ڈان پرنٹنگ پریس ناظم آباد نمبر 2 کراچی۔	
قیمت	۶۰ روپے

-----○ لئے کی ہے ○-----

- مکتبہ ہم زبان ایف ۲ / ۸۳ مارٹن کوارٹرز، جہانگیر روڈ کراچی ۷۴۸۰۰
- مکتبہ فکر و خیال ۱۷۲ سٹیج بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور ۱۸
- پنجاب پبلک ہاؤس اردو بازار کراچی
- بینک بکس۔ گل گشت کالونی ملتان

ترتیب

حروف تعریف (اوارہ)

- ۱۔ غالب نامہ ۱۱
- ۲۔ اردو کی ادبی نثر اور غالب ۲۸
- ۳۔ غالب کے طرفدار ۳۸
- ۴۔ غالب شکن ۴۰
- ۵۔ غالب کے دیوان ۷۳
- ۶۔ دستنبو ۷۸
- ۷۔ ضخیمہ (دستنبو کا اردو متن) ۸۲

حرف تعارف

تنقیدی اور تحقیقی نقطہ نظر سے غالب پر بہت کام ہوا ہے لیکن سچر بھی کہہ ہے: "ذیرۂ میں آسمان" غالب کے موضوع پر ریاض صدیقی کے چند مقالہ کا مجموعہ ہے۔ ان مقالات میں معتف کا تنقیدی رویہ رواجی تنقید کے عوی ریشے سے ذرا مختلف ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انہوں نے پہلی بار غالب کی نثر نگاری کو موضوع بنایا ہے اس پر پہلے بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن ریاض صدیقی کا اندا نظر اور ان کے عزائم ان مجموعی نثریروں سے مختلف ہیں۔ ان کے خیال میں بڑی ادبی نثر کا اولین ہیر و غالب ہیں۔ بنیادی طور پر اس مجموعے میں شاعری کو موضوع نہیں بنایا گیا ہے "ذیرۂ میں آسمان" کے معتف نے اس حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے پیش نظر ہیں۔

• میر، نظیر، غالب، اقبال اور فیض اردو کی بڑی شاعری کے عناصر خمسہ ہیں۔ ان میں سے غالب اور فیض کو یہ برتری بھی حاصل ہے کہ انہوں نے بڑی ادبی نثر لکھی ہے۔ اہل نظر کی اس فہرست کو نظر انداز کر کے کوئی عہد اپنی تاریخی و تہذیبی عظمت کو برقرار نہیں رکھ سکتا ہے۔ یہ کبکشاں مقام کے اعتبار سے برصغیر کے آفتن پر چمکتی ہے لیکن کرۂ ارض کے ہر کونے سے اس کا مشاہدہ و مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں وہ فضا اور تہذیب دکھائی دیتی ہے جس کی ماہیت اور اثر پذیری عالمگیر ہے۔ یہ بین الاقوامی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اقبال کے سوا باقی چاروں بڑے اہل نظر کا موضوع انسان ہے جو مذہبی ثقافتی نسلی اور ملاقاتی تفریق سے بالاتر ہے۔ انسان دوستی اور انسان نوازی کا جو رویہ ان شاعروں کے یہاں ملتا ہے وہ امریکی فلسفی ولیم جیمز کے فلسفہ

انسان و دوشی یعنی "ہیومنزم" سے کوئی ملالت نہیں رکھتا ہے۔

غالب پر پہلے ہی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ! اس سوال کا جواب دیتے وقت نے کہا بڑے ادب اور بڑے ادیب کے لئے ضروری ہے کہ ہر نئے اور اور ہر اس وقت میں جو بڑی تبدیلیوں سے گزر چکا ہو فن اور افکار و نظریات کی از سر نو تعبیر و تشریح کی جاتی ہے مغرب میں بڑے کلاسیکی شاعروں اور ادیبوں پر اب بھی باقاعدگی سے کتابیں آرہی ہیں۔ ہمارے یہاں عظیم شاعر و نثر نگار غالب پر غالب صدی ۱۹۶۹ء تک تحقیقی و تنقیدی کام ہوتا رہا لیکن شرح و مقدار کے اعتبار سے یہ کام اقبال کے مقابلے میں بہت کم تھا۔ حکومت نے اقبال کی سرپرستی کے لئے بڑے اور مضبوط ادارے قائم کئے۔ مذہبی پیشواؤں نے ان کی ملاؤں و شخصیت کے باوجود ان کی شاعری کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا اہل سیاست نے اقتدار تک رسائی کے لئے ان کا استعمال کیا اور معتبر مورخوں نے بھی ان کے ساتھ اسی قسم کا سلوک روا رکھا۔ مرزا غالب یہاں اس قسم کی سرپرستی سے محروم رہے سنہ ۱۹۶۰ء کے بعد سرکاری حکمت عملی کی ناکامی و وطن پرستی اور نظریہ لازمی کے نتیجے میں ملاقاتی ثقافتوں زبانوں اور قوم پرستانہ جذبات کا اہل شرمع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان جذبات نے تعلیم کی صورت اختیار کر لی۔ اس صورت حال کا اثر کم سے کم ملحد ادبی قلم و پر مرتب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن علماء اور اہل نظر و دولت آگے سے مالا مال اور انتہائی حساس طبقہ ہو رہا ہے۔ وہ منفی رویہ میں بہنے کے بجائے صحیح خطوط پر ان کی تنظیم و ترتیب کرتا ہے تاکہ قومی شیرازہ بکھر نہ پائے اور سوچنے والے ذہن بے راہ روی کا شکار نہ ہوں۔ ہمارے یہاں بدقسمتی سے علماء اور اہل نظر منفی تحریکات سے انحراف کرنے کے بجائے اس کے مساوی بیٹھے جھپٹے گئے۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ ڈاکٹر سید محمد اللہ جیسا جید اہل قلم جس کی پرورش سرسید اور حالی اسکول کی گود میں ہوئی اپنی عمر کے آخری حصے میں حالی سے گریزاں دکھائی دیا۔ ان حالات ہی کے نتیجے میں غالب جیسا شاعر و نثر نگار ہمارے لئے اجنبی اور غیر ملکی

بن گیا۔

زیر نظر مجموعے میں انیس ناگی اور ڈاکٹر ملک حسن اختر کے سوالوں کا ذکر اکثر آیا ہے اس سلسلے میں مصنف نے بتایا کہ پچھلے دس سالوں میں غالب سے اختلاف کرنے والوں میں ان دو فاضل نقادوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اختلاف اگر علمی و فکری اور تنقیدی اصولوں کی پیروی میں ہو تو ہنایت محرم عمل کہا جائے گا لیکن جب یہ علت ذاتی معاملات اور غیر ضروری واقعات کی کھینچ تان پر اسٹائی جائے تو اس کو کم سے کم کج کی جدید دنیا میں مہذب انداز نظر سمجھنا زیادتی ہوگا۔ انیس ناگی اور ملک حسن اختر نے علمی و فکری ہنج سے ہٹ کر ذاتی اور غیر ضروری واقعات کو موضوع بنالیا ہے ان کا مطلع نظر نفس ایک شخصیت اور اس کے کردار کو مسخ کر کے پیش کرنا ہے۔ زیر نظر مجموعے میں ایسی حوالے سے ان حضرات کا ذکر ہوا ہے۔ اس کو غالب کی طرف ذرا سی نہ سمجھنا چاہئے۔ بلکہ مض و فاح سمجھنا چاہئے انگریزی ادب میں اختلافی موضوعات پر اس قسم کی دفاعی تحریریں ملتی ہیں جن کو اب کلاسکس کا درجہ حاصل ہے اردو میں ایسی تحریروں کا رواج کم رہا ہے۔

اس مجموعے میں غالب شکن لیگانہ اور غالب نواز عبدالرحمن بجنوری کا خصوصی تنقیدی مطالعہ بھی شامل ہے ریاض صدیقی کہتے ہیں کہ ۔

انیس ناگی اور اختر صاحبان سے بہت پہلے غالب شکنی اور غالب کی قصیدہ خوانی کی گئی تھی یہ سب ایک جذباتی رد عمل تھا۔ ان دونوں دستاویزات کا تنقیدی نقطہ نظر سے کوئی مائزہ اب تک قلمبند نہیں کیا گیا چنانچہ اس موضوع کو خاص طور پر مجموعے میں شامل کیا گیا ہے۔

مجموعے کے معق ریاض صدیقی برصغیر کے جاننے پہچاننے نقادوں میں ہیں۔

اردو کی جدید سائنس تنقید میں ان کا مجموعی کام کسی بھی معروف نقاد سے کم نہیں ہے انہوں نے حالیہ و تازہ عصری مسائل اور اپنے گرد و پیش موجود صورت حال

کو جس تفہیل کے ساتھ موضوع بنایا ہے قابل توجہ ہے۔ پہلے یہاں کی ثقافتی صورت حال، تعلیمی انصافات کدے معنویت، ذرائع ابلاغ کے کردار، مذہبی مشوروں کی فطرت رہنمائی اور تاریخ نویسی کے منتفی رجحانات پر انہوں نے اپنے تنقیدی سے مضمونوں میں بحث کی ہے جدید لسانی فلسفے اور فلسفہ سائنس پر بھی ان کو دسترس حاصل ہے تاریخ اور تاریخی شعور ان کی ادبی تحریکوں میں خاص طور پر نمایاں نظر آتا ہے تاریخی نقطہ کے بارے میں انہوں نے تاریخ کے سائنسی نظریے سے استفادہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تاریخ میں فرد کے بدلے سماجی و تہذیبی اور اقتصادی و سیاسی تناظر میں مطالعہ کرتے ہیں۔ تاریخت کے بارے میں شکاگو اسکول اور امریکی نیو کلائم کے نقطہ نظر کو انہوں نے رد کیا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں جرأت گفتار اور فکری اختلافات کے اظہار کو معزز مقام نہیں دیا گیا ہے

اور اس قسم کے لوگوں کو بڑے اعتماد کے ساتھ متنازعہ کہا جاسکتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کے جدید کے مقابلے ہماری سطح کس قدر پست ہے۔ ریاض صدیقی کو اسی لئے معذرت علمی و ادبی حلقے بالشرادیب و نقاد اور ادبی رسائل نظر انداز کرتے رہے ہیں حتیٰ کہ وہ حلقہ جس سے ان کی دیرینہ وابستگی ہے ان کے گریز نظر آتے ہیں چنانچہ ڈاکٹر خورشید نے اپنی تازہ تاریخی کتاب میں سے ترقی پسندیت سے اختلاف کا اظہار کرنے والوں کو جگہ دی ہے لیکن اپنے ہی مائذ ان کے سینئر سرگرم کارکن کا نام تک نہیں دیا ہے۔

ریاض صدیقی کے نقطہ نظر سے اختلاف و امتزاج کا حق ہر لکھنے والے کو ہے یہ بھی ضروری نہیں کہ ادارہ ان کا مجموعہ اس لئے شائع کرنا ہو کہ ان کے نقطہ نظر سے اتفاق ہے۔ ادارہ کا مطلع نظر صرف یہ ہے کہ کسی بھی ادیب کے شعور علمی و ادبی کام کو منظر عام پر آنے کا موقع دیا جائے۔ ہم اسی جذبے کے ساتھ یہ مجموعہ شائع کر رہے ہیں جو اردو کی ادبی تنقید میں ایک اضافہ ہوگا۔

غالب نامہ

اشعار ہوں مدی عیسوی برصغیر کے لئے آگ و خون کی صدی تھی فرمانروائے
 کشور ہندوستان عالمگیر کی بے مثال جہاں بان دجہاں دانی کا یہ بیخبر ہوا کہ مختلف
 فرقوں اور طبقوں میں باہمی نفرتوں کا لاد ا لاد ہے اندر جمع ہوتا رہا۔ اس صورتحال
 کی پرورش اشعار ہوں صدی کے بعض راسخ العقیدہ مذہبی پیشواؤں کے
 ہاتھوں ہوئی جن پر آسمان سے عالم خواب میں حکم ربی نازل ہوتے تھے۔ وحدت
 الوجود کے مسک کی پیروی کرنے والے ہنگامہ دارین عالمگیر کی نظر میں جو راسخ العقیدہ
 مذہبی پیشواؤں کا سوہرست بھی تھا دائرہ اسلام سے خارج تھا اور واجب النقل
 تھے چنانچہ برصغیر کو بے راہروی سے بچانے کے لئے شہزادے نے اپنے حقیقی پر
 اور وارث تخت و تاج دارا شکوہ کا صرف سر ہی قلم نہیں کر دیا بلکہ اس
 کی لاش دہلی کے چور ہے پر لشکادی لگی تاکہ طاقت و سمیت عوام کے ذہنوں
 پر مسلط ہو۔ اورنگ زیب اور اس کے صاحب بصیرت شیر اس نفرت اڈ
 گھٹن سے بے خبر تھے جو ہر طرف سنگ دہی تھی۔ ان حالات ہی کا کرشمہ
 تھا کہ اس کے مرتے ہی سبقت اقتدار بقول ایس ٹی سنو نے یوں بکھر گیا جیسے
 تاش کے پتے بکھر گئے ہوں۔ فرمانروائے ہند کی ذہانت اور سیاسی بصیرت کا
 اندازہ تو اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ برصغیر میں اتحاد کے پلانے آنے والے
 انگریزوں کو اس نے قطعی نظر انداز کیا جن دلوں وہ ملتان کا گورنر تھا۔ انگریز
 مسند اور دوسرے علاقوں سے خولے کی بھاری مقدار انگلستان بھیج رہے تھے

اگر وہاں بارود ساز صنعت دھماکہ پیدا کرنے والے ہتھیار بنائے۔ گجرات کی گوری
 نے۔۔۔ میں عالمگیر نے اس تجارت پر پابندی ضرور عائد کی اور صحیح اندازہ لگایا
 کہ اس طرح برصغیر میں مثل اقتدار کو خطرات پیدا ہو جائیں گے لیکن جب
 وہ سندھ میں گورنری کر آیا تو یہ پابندی ختم کر دی اور ان تمام مراعات کو
 جاری رکھا جو شاہجہاں کے حکمرانوں کی بناء پر انگریز تاجروں کو حاصل تھیں
 وہ اپنی علیحدہ فوج بنا سکتے تھے اپنے علاقوں کا انتظام کر سکتے تھے حتیٰ کہ داخل
 نافذ کرنے کا بھی اختیار رکھتے تھے بلذاتی ادارے بنا سکتے تھے اور اپنے سب
 ٹیکسال میں ڈھلنے کی رعایت سے فائدہ اٹھا سکتے تھے گویا احمد عالمگیر ہی
 میں برصغیر کی بساط پر انگریزی مہر سے اپنی شاطر چال چل رہے تھے اور گ
 زیب کے بعد یہ بارود جو لندہ ہی اندر سبک رہا سفاد حملہ کے ساتھ پھٹ پڑا
 مرہٹوں اور جاٹوں نے وہی اور اس کے اطراف میں کھرام مچایا جس سے نجات
 کے لئے اس احمد کے عظیم صوفی دانشور شاہ ولی اللہؒ کو اسی میں بہتری
 محسوس ہوئی کہ افغانستان کے حیرت مند لیڈرے نادر شاہ کو کفار کی مکر توڑنے
 اور مسلم اقتدار کو بچانے کی دعوت دی جلتے تاجرخ کی یہ سب سے اہم اور
 فیصلہ کن غلطی تھی جو جہاں سے بزرگ سے مرزد ہوئی اور نادر شاہ نے برصغیر
 میں مسلم اقتدار کی مکر توڑ کر رکھ دی۔ ان حالات میں شاہ عالم کے پاس کوئی
 راستہ اس کے سوا تھا بھی نہیں کہ وہ جنگال کو انگریزوں کے حوالے کر دے کیونکہ
 ۱۷۵۷ء میں ایٹ انڈیا کمپنی بہادر کی ان فوجوں نے جو مغل حکمران تھے کسے
 رعایت حاصل کر کے انہوں نے تیار کی تھی ایک مسلم نثار کی مدد سے سرساج الدولہ
 کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اس طرح انگلستان کے تاج برطانیہ کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا
 اور برصغیر ان کی "ورلڈ مپائر" کے منصوبے کی تکمیل کا سبب بنا۔ ایٹ انڈیا کمپنی
 اب مغل اقتدار کی جگہ لے چکی تھی اور کمپنی بہادر کا حکم نامہ جاری ہو گیا تھا۔ بیسویں
 صدی کا فرما نزلے ہندوستان ایٹ انڈیا کمپنی کا وظیفہ خوار تھا جس کو قلعہ

معلیٰ کی حدود سے باہر کسی بھی چیز پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ اس دور میں عموماً امرا و مشرفا انگریزوں کے تنگ خوار و وفادار تھے اور اکثر مشرفا ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمتوں سے وابستہ ہو گئے تھے اس پر آشوب اور غیر یقینی دور میں جہاں قانون، سکڑا اور انتظامیہ وعدلیہ انگریزوں کے قبضے میں تھی یہ مقام اگر ۱۷۹۷ء میں مرزا غالب نے جہنم لیا تھا۔ ان کا نام مرزا اسد اللہ خاں تھا اور یہی نام خود غالب نے ۱۸۲۷ء کی ان عرصوں پر لکھا جو پنشن کے سلسلے میں دی گئی تھی۔ والد عبداللہ بیگ سلجوقی ترک تھے۔ آبائی پیشہ سپاہ گری تھا وہ مہاراجہ انجھڑ کے یہاں ملازم تھے اور کسی ڈرائی میں ملائے گئے تھے اس طرح وہ عمر کے بہت ابتدائی دنوں میں والد کے سائے سے محروم ہوئے اور چچا نصر اللہ بیگ نے ان کی کفالت کا ذمہ لیا۔ جو کہ قلاب احمد بخش کی بہن کے شوہر تھے ان کی تحویل میں انگریزی سرکار کی دی ہوئی فیروز پور جیل اور مہاراجہ بہنادر سنگھ کی دی ہوئی لواحہ بڈی جاگیر میں تھیں ان کے چچا لارڈ لیک کی سرکار میں چار سو سواروں کے حاضر تھے ابھی غالب کی عمر زیادہ نہیں ہوئی تھی کہ چچا کا بھی انتقال ہو گیا۔ لارڈ لیک نے جاگیر دیتے ہوئے قلاب احمد بخش پر یہ مشروط عائد کی تھی کہ وہ نصر اللہ بیگ کے لواحقین کی کفالت کرتے رہیں گے اس پس منظر میں کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے آباء اجداد سرکار انگریزی کے خدمتگار تھے لیکن اس خدمتگاری کا طعن غالب کو کیونکر دیا جاسکتا ہے جیسا کہ انیس ناگ نے لکھا ہے کہ ان کے چچا اور والد بھائی کے سپاہی تھے۔ اس جملے کی ساخت کے پس پشت لکھنے والے کی نیت ظاہر ہوتی ہے اس طنز میں حقارت آمیز رویہ صاف جھلکتا ہے ان دنوں کی اقتبادی اور سیاسی صورت حال نے اکثر لوگوں کو انگریزوں کی خدمتگاری پر مجبور کیا۔ چنانچہ سیاسی اور اقتصادی

لے شیخ اکرام داک نام نے اسد اللہ بیگ اور عالی دہرخی نے اسد اللہ خاں لکھا ہے۔

مجبوریوں کو حوالہ بنا کر انگریز پرستی کے الزامات عائد کرنا اور ان الزامات کے ساتھ اپنی نازیبا زبان استعمال کرنا عالمانہ شان و اعزاز کو داغدار کرتی ہیں اللہ! میں غالب نے املو جان کی زنجیر پہن لی یہ رشتہ ظاہر ہے کہ ان کی مرضی پر نہیں ہوا تھا رشتہ میں وہ اگرچہ چھوڑ کر دہلی آئے اس وقت وہ ایک محوم شخص تھے جس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا مگر اور پیش کا حق حاصل کرنے کے لئے انہوں نے بہت کچھ کیا مگر ناکام ہے۔ اس کے لئے انہوں نے انگریزوں کا کام کے دروازے کھٹکھٹائے ان کی شان میں قصیدے لکھے اور ان کو خوشامد القاب و آداب سے مخاطب کیا کہ یہی طریقہ مانج تھا ہمارے معتمد و فاضل انیس تاگی اور ملک حسن اختر نے ان واقعات کا سہارا لے کر جس طرح غالب کی کردار کشی کی ہے انہوں نے اس کا طرز عمل ہے دور حاضر کے ایسے دانشور و فاضل علماء کو جو آج بھی اپنی نمائندہ و آزاد حکومت میں "آپ کا تابعدار" (Your Most Obedient Servant) اور "مودبانہ عرض" (Most Respectfully) وغیرہ جیسے فقرے لکھنے پر مجبور ہیں اس قسم کا انداز نظر زیب نہیں دیتا ہے ان حضرات کو اچھی طرح علم ہے کہ برطانوی ہول سرکس سرکاری و جاگیرداری روایات کا جو ڈھانچہ ہمیں سونپ گئی ہے اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے اس قسم کے معتمد ضمیمہ بیوی یہ صدی کے ان عظیم ذہنوں پر کیوں تنقید نہیں کرتے ہیں جو انگریزوں کے خلاف جدوجہد کے ملک گیر جہد میں انگریزوں کی وفاداری کا دم بھرتے تھے یہی نہیں بلکہ غالب کی گھریلو زندگی کا ذکر کرتے ہوئے ہمارے فاضل نقاد اور عصر نو کے رنگانہ غالب شکن لکھتے ہیں کہ تاہم غالب کی مصروفیات کچھ اس قسم کی تھیں کہ کوئی خاتون خانہ اُسے برداشت نہیں کر سکتی تھی، جو اکھینا گھر میں شراب کشید کرنا اور دوستوں کے ساتھ گپ بازی کی طویل نشستیں.....

غالب کی تعلیم کے بارے میں مستند معلومات کا فقدان ہے لیکن ان کے

شاعری اور مجموعی تحریریں گواہ ہیں کہ وہ عربی فلسفی اُردو اور ہندی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے اور انگریزی زبان سے ان کی شناسائی معمولی سہی مگر شعلی البتہ راز صرف ڈاکٹر ملک حسن اختر کو معلوم ہے کہ انہوں نے دستبنو کے عبادت سے عربی الفاظ صرف اس لئے نکال دیئے تھے کہ اگر یہ انہیں مسلمان نہ سمجھو بیٹھیں، صرف دشوہ منطق و فلسفہ اور نجوم و تارخ جیسے موضوعات پر بھی ان کی دسترس کے واضح ثبوت ملتے ہیں علمی موضوعات پر یقیناً ان کو کسی قدرت حاصل تھی جس کا مقابلہ معاصر علماء سے نہیں کیا جاسکتا ہے غالب کے سوانح نگاروں نے ان کے ایک استاد شیخ معظم کا ذکر کیا ہے جبکہ حالی نے **عبد اللہ** کا نام لکھا ہے لیکن مرزا کی بعض تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تجربہ اور زمانہ ہی ان کا استاد تھا و شیخ عالم سے ہٹ کر چلنا ان کا شعار تھا اور ایک ایسے ٹھہرے ہوئے دولتی معاشرے میں جب شاعر کے لئے استاد کی شرط تھی ان کلبے استاد رہتا اسی شاعر کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان پرانیسویں صدی کے روایت پرستوں کی بے جا تنقید میں بے استاد ہونے کا طعنہ بھی شامل تھا۔ مرزا شعور کی بہت ابتدائی دور ہی میں مشکل پسندی کا شوق انہیں کہیں سے کہیں لے گیا اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد علمی و ادبی روایات سے لاتعلقی تھے اور انہیں ذوق شعر و ادب ورثے میں نہیں ملا تھا۔ مشکل پسندی کے اس عمل میں بھی ان کی ذہانت ان کے ذوق مشاہدہ اور جستجوئے حقیقت کی کوشش کا فرما تھی۔ بیدل کا فلسفیانہ اعجاز ان کو پسند آیا اور اس کی مشکل پسندی کو انہوں نے فن شاعری سمجھا یہی وجہ ہے کہ پیروی بیدل میں وہ ہمل شعر کہتے تھے میران کے پہلے نقاد تھے جنہوں نے ان کے کلام میں موجزن شعلگی (sparkling) کو محسوس کرتے ہوئے

اے غالب اور ان کے بھائی مرزا یوسف کے لئے ڈیڑھ ہزار ملاہان کی رقم مقرر کی گئی تھی۔

کہلے یا تو یہ بہت بڑا خاص ہو گا یا پھر اول فول بجے گا۔ طرز بیدل میں شعر گوئی کی
مشق ماس نہ آئی اور خود انہوں نے محسوس کیا کہ

طرز بیدل میں ریختہ کہنا اسد اللہ خاں قیام تھے

خود تنقیدی اور خود احتسابی کا یہ عمل ان کو سیدھے راستے پر لے آیا گویا اُن کا
شعور ہی ان کا مصلح ثابت ہوا۔ یہ فرد کی ایک ایسی خوبی ہے جس سے اب ہمارے
اہل نظر نہیں دامان نظر آتے ہیں اور صاف مستحقری ادبی و علمی تنقید بھی انہیں
و معلومت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ جس ذوق و شوق کے ساتھ انہوں نے بیدل سے
ذہنی رشتہ جوڑا تھا اتنی ہی تیزی کے ساتھ اس کو غیر یاد بھی کہا چنا پتہ اہل
نے ایک اپنا منفرد اسلوب اصطناع پیدا کر لیا۔ اردو کلام کا جو انتخاب انہوں
نے ۱۸۶۹ء میں کیا تھا اس میں طرز بیدل کے چند نمونے لپٹے جیسے اس لئے
ہیں کہ وہ چالاک تھے جیسا کہ ڈاکٹر حسن اختر کا خیال ہے بلکہ اس لئے کہ یہ
نمونہ دوسروں تک پہنچ سکے اس کی وضاحت وہ ایک مراسلے میں کر گئے ہیں
اور اس سے ان کے ذوق نقد کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ ان کا عہد
تاجی و سائسی اصولی تنقید سے یکسر نا آشنا تھا۔ ان حقائق کے حوالے سے منفی
انداز نظر رکھنے والے بد نما خاکہ بھی بنا سکتے ہیں جیسا کہ ملک حسن اختر اور انیس
ناگی نے بنایا ہے غالب نے اس قسم کے طرز فکر کا گلہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ

”اب آبروئے شیوہ اہل نظر گمنی“

غالب نے نہ تو گھر کی چار دیواری میں بند ہو کر شاعری کی اور نہ دوبارے
مغل آرائیاں ان کے لئے تخلیق کا محرک بنیں بلکہ یہ مشق سیاسی و سماجی اور
اقتصادی زندگی کے ساتھ ساتھ جاری رہی ہیں وجہ ہے کہ ان کی شاعری اور
نثر میں انیسویں صدی کی روح اور زندگی سمٹ آئی ایک مٹی جوتی روایت اور
تہذیب کا احساس ابھرا اور ایک نئی آنے والی دنیا کا شعور پیدا ہوا یہی وجہ
ہے کہ طوفان آمد آمدِ فصل بہار کا وہ ذکر کرتے ہیں اور گرمی نشاط تصور نہیں

نغمہ سرائی پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ اس صدی کے نقیب تھے جس میں اب ہم زندگی بسر کر رہے ہیں چنانچہ انہوں نے جو کچھ لکھا وہ آئندہالی صدی کے لئے ستارہ واقعی مندریب گلشنِ ناز فریدہ تھے۔ دہلی میں صورِ شمال کی دوہری چلاں سے ان کا گنگا ڈھوا کیونکہ وہ خود کو حویلیوں محل سراؤں اور خانقاہوں کے غول میں بند نہیں رکھ سکے۔ ایک طرف اردو کی کلاسیکی شعری روایت اور مغلی ثقافت گرد و پیش کے مجموعی عوامل سے لائقِ چراغِ آخر شب کی طرح سبک رہی تھی اور قلعہ شاہی کے اندر حضور شاہ میں شعر و سخن کی آزمائشیں جاری تھیں تو دوسری طرف سماجی و اقتصادی انفرادی برصغیر کے مسلم تہذیب و سیاست کے پورے جسم میں کینسر کی طرح پھیل چکی تھی۔ روایات و افتادہ اخلاقیات اور علم و ادب کے فلکِ بوس محل میں گرد آؤ رہی تھی اور معاشرتی و سیاسی اور تہذیبی غددِ خال نئے رنگ و روپ میں اس پہلے کے اندر سے اُبھر رہے تھے امرا و رؤسا اور علما کا وہ طبقہ جس کے لئے ذوقِ جیسے سلی شاعر کا استاد شاہ ہونا ہی اسوار تھا اور جو صدیوں کی تہذیبی و روایتی انیون میں مست اس یقین پر تکیہ کئے بیٹھا تھا کہ جو کچھ جیسا ہے ایسا ہی ہے گا ایک خول میں بند زندگی گزار رہا تھا۔ غالب اکہلا شاعر تھا جس نے جو خوابِ معاصرین کو چونکانے کی کوشش کی تبدیلی اور ارتقاء کے سائنس اصولوں کو شعوری طور پر قبول کیا اور اپنی اس جدتِ نوازی کے عوض معاصر اساتذہ و علما کا اختلاف مول لیا۔ آخری یادگارِ مشاعرے میں جن اساتذہ نے اپنا کلام سنایا اس میں نہ تو کسی تبدیلی کا ذکر ملتا ہے اور نہ ہی کسی — تشویش کا کوئی اشارہ لیکن اس الجھن میں وہ تنہا شاعر تھا جس نے لطیف اشاراتی پیرائے میں بادشاہِ وقت اور ان کے قعبیدہ خواہوں کا لفظ سنایا لیکن یہ اشعار اساتذہ اور سامعین کے مرنے سے گزر گئے۔ اس مغفل میں بھی جو کہ اپنوں کی تھی غالب کو وہ مقام نہ ملے سکا جس کے وہ مستحق تھے چنانچہ اگر لاشِ صاحب کے درباروں میں ان کی

نشست آخری ہیں رکھی گئی تو ہمیں ناگی کو کوئی شکایت نہیں ہونا چاہیے تھی۔ لیکن انہوں نے بڑی شان سے یہ شکایت کی ہے جس کے ذریعے وہ دور حاضر کے قارئین کو غالب کی ناقدری ادبے حرمی سے روشناس کرانا چاہتے ہیں گو یا قدر شناسی اور عزت و تکریم کا معیار ان کے لئے سنا ہی دوبارہ انگریزوں کے دیار اور استاد ذوق ہیں بالکل اسی طرح جیسے آج کل صحافی قسم کے شاعروں اور نقادوں کے لئے مگناہم سدا کا دمی ادبیات پاکستان ہے انہیں ناگی لکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ جب انہیں گورنر جنرل کے دربار میں آخری قطار میں نشست ملی تو غالب کو بے پایاں رنج ہوا: ... غالب اپنی بیماری اور ناطاقتی کے باوجود اس غرض سے دربار میں گئے تھے کہ ان سے ترجیحی سلوک کیا جائے گا لیکن ان کا یہ سہم لٹ گیا اور انہیں دربار میں آخری نشست پر جگہ دی گئی۔

غالب کا قیام اگرچہ اس اعتبار سے مفید تھا کہ وہاں زندگی کی ساری کمائشیں اور نوابی مشاطہ ہاٹ حاصل تھے ایک ایسا شخص جس کے آہاؤ ابداد طبعہ خاص سے وابستہ ہے ہوں اور جس نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی ہو یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے ماضی کے خاندانی ورثے سے یکسر منہ موڑ لے صحیح نہ ہوگا یہی وجہ ہے کہ اقبال بحیثیت پرنازاں ہے انہیں ناگی نے جدید نفسیات کے اصول، تحلیل نفسی کے سامنے حربے غالب پر استعمل کرتے ہوئے ان کے فاقی معاملات کو موضوع بنایا ہے اور ان کی عمر، میوں اور مجبوریوں کا مذاق اڑا کر ان کے مجموعی کردار کو بری طرح مسخ کر دیا ہے۔ یہ کسی ایک فرد کی نہیں انیسویں صدی کے محروم و محکوم انسانوں کی برحرمی بھی کہی جاسکتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ "عامی قرض دار کی نفسیات عام آدمی کی نسبت مختلف ہوتی ہے جھوٹ تعلق اور وعدہ خلافی اس کی عادتِ ثانیہ بن جاتے ہیں۔ غالب کی شخصیت بھی ان خصوصیات سے شاید مبرا نہیں تھی۔ غالب کے عزیز و اقارب

سب جھوٹا بنا کر رکھے اگر بحیثیت فرد واحد غالب ان کمزوریوں کا نمونہ تھے تو کم سے کم ہمیں اپنے گریبان میں سر پہ جھانک لینا چاہیے کیونکہ ہماری توپور سے تو کم قرض کے جال میں جکڑی ہوئی ہے اور بازار میں مغرب کا شیلے صرف سے سہری ہوئی ہیں گویا پوری قوم کی نفسیات عادی قرض خواہ کی نفسیات بن چکی ہے وہ جھوٹی اتنا کا شکا ہے اور پدیرم سلطان بود ہمارے تقریباً تمام علما اور مورخوں کا مسلک ہے جس نئی وجہ سے پوری قوم پدیرم سلطان بود کے نقشے میں سرشار ہیں۔

غالب نے قیام دہلی کے دوران دو ایسی دنیاؤں کا مشاہدہ کیا جو کسی بھی سرے پر ایک دوسرے سے نہیں مل سکتی تھیں۔ یہاں ایک قلعہ معلوے امراء، شرفاء، کلاسیکی دیانت کے پرستار تھے تو دوسری طرف انگریز، انگریزوں کا دہلی کالج، انگریز ریڈیڈنٹ کاذفر ڈپٹی کمشنری اور مغل تہذیب کے سیاہ انقب پر انگریزی تہذیب، جمہوریت، طرز تعلیم اور سائنس ایجادات کی جھلک تھیں ایک دنیا ان کی اپنی تھی جس سے وہ مالاوس تھے کیونکہ اسی کی گود میں انہوں نے پرورش پائی تھی اس میں صدیوں کے سفر نے کوئی خاص تبدیلی نہیں پیدا کی تھی دوسری دنیا بہت نئی اور اجنبی بلکہ طلسم ہوش رہا تھی وہ آزادی و جمہوریت اور طرز انتظام و تجارت کے وہ تصور تھے لائی تھی جس سے ہر صغیر کے لوگ لاعلم تھے اس کے جلو میں علوم و فنون اور سائنس کا وہ سرمایہ تھا جس نے لوگوں میں حیرت نگہد بھان کو جنم دیا مسلم نفسیات کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نے ہر نئی روایت نئی ایجاد اور نئے منظر کو اپنی روایت و اقتدار اور عقائد و افکار کے خلاف سازش سمجھا اور اس کے خلاف مسلح انصدام کسے حکمت عملی سے کام لیا یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی میں یہ وہم و بیکاری طرح عام ہٹا کر انگریزی زبان و تہذیب اور سائنس و جمہوریت کا مقصد مسلمانوں کو طاقت کے ذریعے عیسائی بنانا ہے۔

غالب کی بدقسمتی تھی کہ جب انہوں نے ان دو دنیاؤں کے درمیان سفر شروع کیا تو حالات نے کچھ اس طرح پلٹا کھلایا کہ سکون و آسائش کے پہلے دن ختم ہو گئے بغیر عالی نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا یہاں تک کہ صبح سے شام کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہو گیا۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ پیدا کر رہا تھا کہ

ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا ایسی صورتحال میں جس قسم کی جھنجھلاہٹ اور لگتا ہٹ پیدا ہو رہی ہے اعلیٰٰ علی واقعہ ہوتے ہیں حیات و کائنات کی طرف سے فساد کا جو رویہ ابھر رہا ہے ان کے یہاں دور دور تک نظر نہیں آتا ہے اپنے عہد کے ماگیزڈ اور شرفاء کی طرح نہ تو وہ گھبراہٹ و زہمیں سے چھٹے ہیں اور نہ ہی صبر و قناعت کی پناہ گاہ ہیں چھپ کر امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑا۔ ان کا یہ دعویٰ ہے مشکلیں اتنی بڑی ہیں کہ آسماں ہو گئیں

بہت صحیح ہے وہ بڑے حوصلے آہنی عزم دارانے اور ہر داشت کے مالک تھے گردش روزگار جہاں لے گئی وہ گئے اپنی جائز اقتصاد و معیشت و ضروریات کی تکمیل کے لئے وہ آخر تک کمر بستہ رہے چنانچہ پنشن کے لئے جو صبر آزمائی کی تھی انہوں نے لڑی لکھی دور میں کوئی اور رو نہیں سکتا تھا اس جدوجہد کی حرمت یوں بڑھ جاتی ہے کہ ساری زندگی آبلہ پانی کے باوجود انہیں آخر تک کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ انہوں نے زندگی کے مجموعی اہلیوں کا مقابلہ اپنی زندہ دلی، احباب و اقارب، وضع واری اور خوشی و غم و اظہار و خوش طبعی اور خوش اخلاقی سے کیا اس اعتبار سے ان کا کردار مثالی اور اعلیٰٰ تھا۔ ان کے یہاں یہ گمانہ کی طرح منفی رد عمل اور اتنا پسندی یا اذیت کوئی کا کوئی رجحان نہیں ہوا۔ وہ ہر حال میں کھتے ہی تھے۔ اختلاف کے تیر بر سر نے والوں کو دو گز رکھتے تھے اور زندگی

کی رنگارنگی سے لکھتے اندوز ہوئے۔ زندہ لمبے اور زندگی کو مثبت انداز سے
 برتنے کی خواہش ۱۸۷۱ء نے ان کی قوت ابادی کو ماند نہیں پڑنے
 دیا۔ عقیدہ پرستی اور تقدیر پرستی (Fundamentalism and
 Fatalism) کو انہوں نے رد کر دیا۔

۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر نے ان کو پچاس روپیہ ملاہانہ پر تاجپوشی
 کا فرض سونپا لیکن وہ اس کام کو ادھورا چھوڑ کر فرانس سے دستبردار ہو گئے
 کیونکہ برصغیر کے حکمران امراء اور مشرفان تاجپوشی کے جس اسلوب کو پسند کرتے تھے
 غالب جیسا جینس عالم اور نقاد اس پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔ انگریزوں کی
 صحبت دہلی سوسائٹی کے ماحول دہلی کالج کے اثرات اور کہنی سے بالبطوں
 نے ان کو انگریزی زبان و تہذیب اور جمہوری انداز نظر سے مایوس کر دیا تھا۔
 چنانچہ جب انہوں نے اس نظام فکر کا مواد برصغیر میں رائج صدیوں پر لکھے
 نظام فکر سے کیا تو ان کی نظر انتخاب اول الذکر کے حق میں رہی اگرچہ پدم
 سلطان بودہ ان کا مسلک ہوتا تو یقیناً وہ آخر الذکر کی حمایت کرتے۔ ۱۸۴۷ء
 میں دہلی سوسائٹی نے ان کو اپنا رکن بنایا۔ یہاں انہوں نے کولڈ اسٹریم کے
 خدمت میں پیش کیا چلنے والا سپا سنامہ بھی لکھا ۱۸۴۲ء دہلی کالج کے
 پروفیسری کا ان کو موقع ملا لیکن بعض نامعلوم وجوہات کی بنا پر وہ اس
 موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ انیس ناگی نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھ لکھ
 ان کا قیاس ہے انہوں نے برصغیر کے بہت بڑے شاعر کا مطالعہ بھی اور
 ذاتی حوالوں سے کیلئے اور اس کے لئے گھر کے مسائل، بیوی سے تعلقات
 قرض کے معاملات پنشن کے لئے تنگ و دو اس سلسلے میں سرکار برطانیہ کو
 لکھے جانے والے خطوں کے وہ جملے جن میں انگریزوں کیلئے خوشامدات کلمات
 ادا کئے گئے ہیں اور اس قسم کے مسائل کا انتخاب کیلئے یہاں تک کراچی
 جنسی زندگی اور نظریات کو بھی موضوع بنالیا ہے ان کا خیال ہے کہ غالب

آزاد جنس کے قائل تھے اگر واقعی یہ بات صحیح ہے تو اس سے ان کی انتہائی بصیرت و بصافت اور حجرات پسندی کا پتہ چلتا، لیکن فاضل نقاد اس فقرے کی مدد سے ان کی خواہش و پراگندگی کا جو تاثر دینا چاہتے ہیں سراسر غلط ہے۔ برصغیر کے ان شرفاء و امراء کی نجی زندگی جن کا اعلیٰ اخلاق و اقتدار کا نمونہ سمجھا جاتا تھا بدترین بے راہ روی اور پراگندگی کا نمونہ تھی اور کج بھی کم سے کم جملے یہاں صورتحال اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔

دور حاضر کے بہترین جدید نقاد ہونے کی حیثیت سے انیس ناگی نے اس حقیقت کا ذکر کرنا ہی گوارا نہیں کیا کہ غالب اپنے عہد کا پہلا درخیز ذہن تھا جس نے انگریزی تہذیب اور جدیدی اعزاز نظر کی جہوائی و نئی روشنی کو خوش آمدید کہا اور قیاسی علوم کے مقابلے میں سائنس کی مداح سرائی کی یہی وجہ ہے کہ وہ فکری جدیدیت جس کو بیسویں صدی میں قبول عام کا شرف حاصل ہوا ان کے یہاں ۱۸۵۰ء کے بعد ایک نظریہ حیات کے روپ میں ظاہر ہوئی حقیقت پسندی، مادیت، سماجی شعور و مقصدیت کے ساتھ ساتھ تنقیدی فکر کے معاملے میں بھی ان کا اعزاز نظر زیادہ سائنس اور تجرباتی محتاج چنانچہ انہوں نے سودا اور ناسخ کی اصلاح زبان کو بطور خام مواد قبول کرنے کے بجائے "غلط الحوام" کے حصول کی پذیرائی کی اور لفظ خبر کو رائج الوقت حواس تلفظ کے مطابق "لمبر" لکھا۔ اس طرح زبان کے بارے میں انہوں نے ایک ایسے نقطہ نظر کی طرف پیش قدمی کی جو بیسویں صدی کے مغرب میں سائنسی اثرات کے تحت فروغ پایا یعنی کہ زبان سماجی عمل (Social Function) ہے اس نقطہ نظر کے دلیل ان کے اردو خطوط ہیں جو انہوں نے ۱۸۵۰ء سے لکھے شروع کئے۔ ان خطوط کے بارے میں ناگی کو شکایت ہے کہ یہاں انہوں نے اپنی نجی زندگی معاشقے اور اپنے ازدواجی حالات کو پردہ اخفا میں رکھا حالانکہ یہ بھی ان کے کردار کی عظمت ہے کہ انہوں نے ذاتی معاملات خاص پر سماجی و تہذیبی او

علمی و فکری معاملات کو فوقیت دی۔ یہ شکایت کہ ۱۸۶۹ء سے سنہ ۱۹۰۱ء تک مالی اور آزاد کے سوا کسی نے غالب کی تحقیر کو درخور اعتنا نہیں سمجھا ایک بے جا بات ہے۔ انہوں نے غالب کے مقابلے میں ان کی کسی ایسے معاصر کا ذکر نہیں کیا جس کی واو و تحقیریں اس دور میں کی جاتی رہی ہو۔ ان کی علمی و ادبی تصنیفات کی تعداد اور اخباروں میں شائع ہونے والا کلام اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے دور کے انتہائی اہم آدمی تھے ان کے خطوط سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا اور قردالوں کا ایک سلسلہ موجود تھا۔ ان کے معاصر اساتذہ کے خطوط کا کوئی سراخ آج تک نہیں مل سکا ہے قصیدہ گوئی اور اہلدار تشکر کے کلمات کو انہوں نے اپنے مضامین اور خطوط کا حصہ نہیں بنایا کیونکہ بغول ان کے یہ تحریریں اقتصاد کی ضروریات کی تشکیل کے لئے کسی گنتی تھیں اور انیسویں صدی میں اس قسم کی تحریریں اقتصاد کی وجہ سے حیثیت رکھتی تھیں مگر انہوں نے اور اٹھارویں صدی میں کپڑی کے انگریز تاجر بھی مغلوں اور حکمرانوں کی اسی طرح قصیدہ خوانی کرتے تھے لیکن یہ کہنا کہ وہ مسلم حکمرانوں اور امریکہ کے حاشیہ بردار اور ایجنٹ تھے لغو بات ہوگی۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے انکار و نظریات سے ان کے تعلق کوئی سند تو نہیں ملتی ہے لیکن مومن اور فضل حق خیر آبادی سے گہرے مراسم اس اثر پذیر کے امکان کا جواز دین سکتے ہیں۔ فضل حق خیر آبادی کا ایسا گہرا تعلق کسی ایسے آدمی سے کیونکہ ہو سکتا تھا جو انگریزوں کا تنگ خوار اور قصیدہ خوان ہو۔ انگریزوں نے تو غالب کو بہادر شاہ ظفر کا سگ لکھنے اور ان کی وفاداری کا مورد الزام بھی سمجھا یا تھا۔

غالب کی زندگی کا بنیادی مسئلہ حصول معاش تھا کیونکہ ان کی زندگی کا بہت بڑا حصہ قرض اور کرانے کے گھروں پر گزرا۔ انیس ناگی ان کے قرض کی رقم تیس ہزار بتاتے ہیں جو کہ آج کل کی شرح کے دو سے کم و بیش لاکھوں ہوتے ہیں انیسویں صدی کو سامنے رکھتے ہوئے یہ مقدار صحیح نظر نہیں آتی ہے حصول

سعاش کے لئے انہوں نے سرکار برطانیہ کے دفاتروں کا دروازہ کٹکھٹایا کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ شاہی دیوان میں اس کے لئے درخواست گزاری احمقانہ بات ہوتی کیونکہ بادشاہ خود کہنی کے ذلیقے پر زندگی گزار رہے تھے۔ ۱۸۲۵ء میں انہوں نے اس مقصد کے لئے رفت سفر باندھا تھا ان دنوں انہیں مبلغ پندرہ سو روپے ماہانہ بطور پنشن مل رہے تھے۔ ۱۸۲۵ء میں سرکار انگریزی سے براہ راست رابطہ کرنے کے لئے انہوں نے کلکتہ کی طرف کوچ کیا اور راستے میں مکھنوا، باندہ، کانپور اور بنارس کے مقامات پر قیام کیا۔ بنارس کے دیو مالائی حسن اور ہندو فلسفہ جمالیات پر مبنی تہذیب نے ان کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ کلکتہ میں ان کی ملاقات سر ولیم فریئر سے ہوئی۔ چیف سکریٹری اینڈریو اسٹرانگ نے ان کی قدر و منزلت کی کچھ تمام تر کوشش کے باوجود ان کو کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ یہ اتفاق تھا کہ ان کے تینوں انگریز ہمدر دیو تو مر گئے یا معزول ہو گئے اور ہاکنس نے بقول ملک حسن اختر ان کے خلاف رپورٹ لکھ کر بنایا کام بگاڑ دیا۔ اس ناکامی کے بعد بھی وہ خاموش نہیں بیٹھے اور ۱۸۳۶ء میں کاغذات لندن روانہ کئے لیکن ۱۸۴۲ء میں یہاں سے بھی ان کے خلاف فیصلہ صادر ہوا جس کے خلاف اسی سال انہوں نے کلکتہ میں اپیل دائر کی۔ ۱۸۳۶ء میں جو درخواست انہوں نے جمع کرائی تھی وہ انگریزی میں لکھی گئی تھی اور اس پر ان کی مہر او دستخط ثبت تھے۔ ۱۸۵۹ء میں بھی انہوں نے پٹن کے ابراہم کے لئے کوشش کی لیکن ناکام ہوئے۔

کلکتہ کا سفر غالب کی زندگی اور ان کے ذہنی اور تقاضیوں میں میل ثابت ہوا یہاں ان کی بہت آؤ بھگت کی گئی اور پہلی بار انہوں نے بہت قریب سے انگریزی تہذیب اور ماحول کو دیکھا۔ خواتین کی آزادی اور مرد و زن کے درمیان مساوات کا تصور ان کے لئے بہت خوش کن تھا انیس ناک کا قیاس

ہے کہ یہاں ان کا تعلق فرسی میں تحریر سے رہا۔ اس قیاس انگشتان کے
 بلے میں حیرت ہی کا اظہار کیا جاسکتا ہے وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ غالب نحاس
 تاریخی عمل کا مشاہدہ کرنے کے بعد نے زنانِ فرنگ کے جمال سے لطف استحباباً حقیقت
 اس کے برعکس ہے کلکتہ میں انہوں نے جدیدہ ذیلی سے پہلا براہ راست رابطہ قائم
 کیا۔ سرسید کے نام سے منسوب فارسی مثنوی میں جن دغائی جہانوں کا ذکر ہوا ہے
 وہ گنگا جمن میں نہیں بلکہ ہنگلی میں چلتے تھے اسی شہر میں ان کا مقابلہ فارسی
 کے معروف استاد شاعر قتیل سے ہوا۔ غالب کو اپنی فارسی دانی اور فارسی گوئی پر
 ناز تھا اور وہ خسرو اور سعدی کے بعد خود کو مستحق تصور کرتے تھے۔ ان دنوں قتیل
 کا شاہہ سروج پرستھا اور ان کے گرد مداحوں اور مصرع اٹھانے والوں کا ایکہجوم
 موجود تھا کلکتہ میں غالب کو اس ہجوم کا مقابلہ کرنا پڑا۔ قتیل کے سرسپرے مداحوں
 اور مصرع اٹھانے والوں نے ان کو بہت ستایا چنانچہ انہوں نے مثنوی باہر مخالف
 لکھی۔ اس ادبی معرکے میں بھی میدان ان ہی کے ہاتھ رہا کیونکہ ہرات کے
 سفیر نے ان کی فارسی دانی کا برسرِ مغل امتحان کیا ان حقائق کو یکسر نظر انداز
 کرتے ہوئے دورِ حاضر کے غالب شکن فرماتے ہیں کہ ان کو اپنی فارسی دانی پر
 ناز تھا اور ذرا سے اعتراض سے ان کی اتنا اتنی مجروح ہوئی کہ یہ واقعہ ان کا
 جیون بن گیا۔

مئی ۱۸۵۷ء سے عام ہے چینی کا آغاز ہوا اور کچھ بیاد رکھیں تو چوں نے اس
 اجنبی سرزمین کی طروت پیش قدمی کی تاکہ فرمانروائے ہندوستان کے سر سے تلخ
 اتار کو ملکہ برطانیہ کے سر پر رکھا جاسکے کیونکہ اب انگریزوں کے نزدیک بہاد
 شاہ ظفر کا مصنوعی وجود کبھی بے معنی ہو چکا تھا اور برصغیر اس منزل پر تھا
 جہاں برطانیہ کی براہ راست حکومت ضروری ہو گئی تھی۔ ۱۸۵۷ء کو جیسا
 کہ غالب کے ایک خط سے منکشف ہوتا ہے میرٹھ ہنگامہ آزادی کا مرکز بنا اور
 جنگ آزادی شروع ہو گئی جنگ کا یہ سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا اور

غالب اس پورے عرصہ میں گھر کے اندر ہی بند رہے۔ احباب نوازی اور محفل آرائی کے تمام سلسلے ٹوٹ چکے تھے چنانچہ مطالعہ اور تصنیف و تالیف ان کا مشغلہ بظہر انہوں نے بہان قاطع پر نظر ڈالی اور جنگ آزادی کے حالات قلمبند کئے۔

غالب کا عہد بڑے کلاسیکی اساتذہ کا زمانہ تھا ان کے معاصرین میں بہادر شاہ ظفر، ذوق، مومن، مہربائی اور شیفہ وغیرہ جیسے معزز شعراء تھے ذوق محفل فیض کے شاعر ہونے کے باوجود اعلیٰ مرتبے پر فائز تھے کیونکہ وہ بادشاہ کے اہل خانہ تھے چنانچہ مطاقی سازش کا رنگ ان کے مزاج میں درج پس گیا تھا غالب جیسے بڑے شاعر اور نقاد سے پیشہ ورانہ رقابت کی بناء پر ان کا ٹکراؤ تھا لیکن غالب کے مذاحوں اور شاگردوں کا ایک طبقہ بھی موجود تھا ان میں حالی اور سرسید بھی شامل تھے۔ ان کا ایک انگریز شاگرد الکٹرڈر عین عالم جوانی میں مر گیا تھا اس کا دیوان مطبع احمدی آگرہ نے ۱۸۶۳ء میں شائع کیا تھا وہ ایک آزاد خیال عقل پسند اور حقیقت میں صوفی مسلمان تھا۔

غالب کو دار کے اعتبار سے ہند اور علمی و ادبی اعتبار سے جامع شخصیت کے مالک تھے جس کا واضح ثبوت وہ تصنیفات ہیں جو ان کی زندگی میں سے شائع ہوئی تھیں۔

دیوان اردو طبع اول ۱۹۲۱ء سید المطابع دہلی دوسری بار ۱۸۴۰ء

تیسری بار ۱۸۶۲ء چوتھی بار ۱۸۶۳ء

دیوان فارسی طبع اول ۱۸۴۵ء دارالسلام دہلی

پنج آہنگ طبع ثانی ۱۸۴۹ء

مثنوی بہادر شاہ ۱۸۵۳ء

بہر نیم روز طبع اول ۱۸۵۵ء فخر المطابع دہلی

دستجو طبع اول ۱۸۶۲ء مفید المطالعون آگرہ دوسری بار ۱۸۸۶ء

نثری سوسائٹی پریس۔

۱۸۶۳ء	تالیع برہان	لکھنؤ
۱۸۶۳ء	کلیات نظم فارسی	"
۱۸۶۴ء	قادر نامہ غالب	مکتبہ پریس دہلی دوسری بار ۱۸۶۵ء
		مطبع محمدی دہلی
۱۸۶۳ء	مثنوی ابرگاہ طبع اولی	اکمل المطابع دہلی
۱۸۶۳ء	اسمائے فارسی	"
۱۸۶۳ء	سوالات مجدد الکرم	اکمل المطابع دہلی
۱۸۶۳ء	لطائف عقیبی	"
۱۸۶۵ء	نامہ غالب	"
۱۸۶۵ء	در نقش کاویانی	اکمل المطابع دہلی
۱۸۶۷ء	رقعات غالب (فارسی)	"
۱۸۶۷ء	شیخ تیز	اکمل المطابع دہلی
۱۸۶۷ء	سید حسین	مطبع دہلی
۱۸۶۷ء	کلیات نثر فارسی	لکھنؤ
۱۸۶۸ء	عود ہندی (اردو)	مطبع مہبتائی میرٹھ
۱۸۶۹ء	اردوئے معلی (اردو)	"

اُردو کی ادبی نثر اور غالب

اردو میں ادبی نثر کا مسئلہ زبان کے مسئلے سے وابستہ ہے لیکن ہمارے فاضل معتبر نقادوں اور تحقیق دانوں نے جدید مغرب کے لسانی فلسفے اور لسانی سائنس سے اب تک استفادہ نہیں کیا ہے۔ علم میرا نیات (Semantical) سائنیات (Structuralism) اور اسلوبیات (STYLISTIC) اردو کی ادبی دہائیے میں موجود نہیں ہیں چند لکھنے والوں نے اس کی طرف پیش قدمی کی کوشش ضرور کی لیکن انہوں نے ان نظریات کو ”ادب ہوائے ادب“ کے مراد جسم میں نئی روح ڈالنے کے لئے بطور میڈیا استعمال کیا ہے۔ نئے ترقی پسند نقاد گروہ بندیوں اور مفاہمتوں کے چکر میں اس طرح گرفتار ہیں کہ ان کی اپنی علمی و ادبی سطح بہت گر گئی ہے ان میں بعضوں کا مطالعہ بہت عام اور سرسری ہے۔

اُردو کی ادبی نثر کا سفر ۱۸۵۶ء میں ان دنوں شروع ہوا جب ڈاکٹر جان مکمل کرائسٹ نے میرامن کو باغ و بہار لکھنے کی ترغیب دی۔ ادبی موزوں نے اردو نثر کی ابتدا کو ۱۳۹۵ھ سے منسوب کیا ہے جب حضرت گیسو دراز نے رسالہ معراج العاشقین لکھا تھا۔ یہ اردو کی اولین عوامی نثر ہے کہ نیک مصنف نے اس میں عوامی بول چال کی زبان لکھی تھی اپنی ہیئت ساخت اور طبع میں یہ نثر بہت مختلف ہے لیکن ادب کے موزوں نے تاریخ سے رشتہ جوڑے لکھنے کی خاطر اس کا ذکر کیا ہے لسانی سائنس کے حوالے سے اس پر کوئی تجزیاتی کام نہیں ہوا یہ دعویٰ بھی کیا گیا کہ ابتدائی اردو نثر کا پہلا نمونہ اخروت جہانگیر کا کوئی رسالہ

ہے لیکن ڈاکٹر ابواللیث مدنی نے اس کے لئے اب تک کبھی سند پیش نہیں کی ہے یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اولین تحریک شیخ معین الدین گنج العلم کی ہے لیکن یہ تحریر بھی دستیاب نہ ہو سکی۔ جس دور کا ذکر ہے ان دنوں اہل اللہ اور ہر گان تصوف برصغیر کے مختلف علاقوں میں سرگرم کار تھے اس بڑی عوامی قوت کا مسلم حکمرانوں اور اس کے امراء سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ ان کا وجود اور مختلف علاقوں میں پھیلاؤ محکراتوں اور امراء کے سیاسی و اقتصادی مفادات اور لسانی نظریے کے لئے ذہن قاتل کا دہرہ رکھتا تھا۔ اس قوت نے اپنے افکار و نظریات کو پسماندہ عوام تک پہنچانے کے لئے شاعری اور نثر کے میڈیا کو منتخب کیا اور ایک ایسے زبان سے رشتے جوڑے جو عام لوگ بولتے تھے علماء اور مؤرخین کے یہ دعوے کہ اہل اللہ اور ہر گان تصوف کا مقصد محض اخلاقی تبلیغ تھا بالکل غلط ہیں۔ ان کے مسلک میں اقتصادی و سیاسی اور لسانی و ثقافتی نقطہ نظر موجود تھا ہی وجہ ہے کہ انہوں نے محکراتوں کے اقتصادی و سیاسی اور ثقافتی و لسانی نظام کو مسترد کیا۔ اس جہد کے شعر و ادب کو جو عوامی زبان میں لکھا گیا سرکار و دربار کی طرف سے نہ تو اشیر و ماحصل تھی اور نہ تحفظ پہنچا چو یہ کہنا کہ نہ ملنے کتنا قیمتی شعری ادبی سرمایہ بے نام و نشان ہوا ہو گا حق بہانہ ہے۔ جو تھوڑا بہت محسن ندی کی تہوں سے مل گیا مولوی عبدالحق نے سمیٹ لیا اور جو کچھ دوسری نئیوں میں بہہ گیا ہو گا اس کا کوئی حساب نہیں اس کے علاوہ بہت کچھ سرکاری گماشتوں نے غلطیوں پر مچاپے مار کر قبضہ میں لے لیا ہو گا۔ اس دور کی دوسری تحریریں میں جن کے حوالے آتے ہیں ”رسالہ شرح مرغوب القلوب“ ۱۲۹۶ء ”رسالہ کلمۃ الوحی“ ۱۳۰۵ء اور ”رسالہ احکام الصلوٰۃ“ ۱۳۱۲ء وغیرہ ہیں۔

اردو کی اولین ادبی نشر ملا وجہی کی داستان سب رس ہے جو ۱۳۲۰ء میں لکھی گئی یہ داستان اگرچہ دکنی سلطان کی فرمائش پر لکھی گئی تھی اور اس کی کہانی کا مقامی حوالوں سے کوئی تعلق نہیں تھا پھر بھی اس کی زبان اور لہجے کے

نوں نے اس میں ملتے ہیں لیکن اس کا سبب فارسی زبہ قسم کا اردو سے دکنی حکمرانوں کا اختلاف تھا اس کو آسانی کے ساتھ اردو نشر کی پہلی ادبی کتاب کہا جاسکتا ہے عام اردو میں لکھی جانے والی نشر کا جو سلسلہ چودھویں صدی عیسوی سے شروع ہوا تھا سترہویں صدی کے ابتدائی دور میں ختم ہو گیا اور اپنے پیچھے بہت تھوڑے سے حوالے چھوڑ گیا۔ اس کے بعد اردو شاعری اور نشر نگاری سے شاہی صبا و ادب امراد و شرفا کی ڈیڑھیںوں تک محدود ہو گئی جہاں اس نے فارسی اخراجات کو سینٹا شروع کیا اس حلقے سے تعلق رکھنے والوں نے جب روایتی فارسی زبان اور شعر و ادب سے کام لیا تو آخر الذکر انہیں متبادل بازاری اور پرمحسوس ہوئی یہاں عوام کا سرمایہ سوا جو تعداد کے اعتبار سے بہت بڑی اکثریت میں ہونے کے باوجود ہر قسم کے حقوق اور رعایات سے انہیں قانون محروم تھے امراد و شرفا ان کو ذلیل کیے اور بدبخت جیسے لفظوں سے نوازتے تھے۔ اردو کی نئی ادبی نشر امراد و شرفا اور درباروں میں بنائی گئی۔ اس کے اسلوب اور لفظیات کے مخصوص پہلوئے وضع کئے گئے مگر ملکتھا: اس کا اولین نمونہ ہے جو فضلی کے زور بیان کا نتیجہ تھی اور زمانہ تحریر ۱۸۳۷ء تھا اس نشر کا ڈھانچہ اسلوب ادبیان فارسی کے اخراجات میں ڈھلا ہوا تھا اور متن وسیع ٹیکٹ اس پر عادی تھی اسی زمانے میں سودا نے اپنے دیوان پر دیباچہ لکھا۔ اس نئی دیباچہ ٹیکٹ میں اولین جامع اور ممکن تصنیف مرزا مظاہر حسین شہید کی داستان نو طرز مرصع ہے اسٹار دیں صدی عیسوی سے اسی اسلوب نے رونق پایا اور یہی سترہویں اور اسیسویں صدی میں فقیر محمد گویا و جب علی بیگ سرور، غلام الم شہید، منشی غلام خوش، خیر نظام علی کسٹوئی، امیر مینائی سر سید احمد خان اور دوسرے اساتذہ نے اس رنگ کو خوب پروان چڑھایا۔ اردو کی تمام ادبی شاخیں اسی زبان میں لکھی گئی۔

انیسویں صدی شروع ہوتے ہی نور شہدائیم کالج میں شعبہ ہندوستانی کے عمل

ڈاکٹر گل کرائسٹ نے سب سے پہلے اُردو کی اس ادبی نشر کو تنقیدی نگاہ سے
 دیکھا بدقتنی دیکھتے کہ اُردو زبان اور شعر و ادب کو بنانے سنوانے کا کام کسی
 ہندوستانی کے ہاتھوں ہونا چاہیے تھا لیکن وہ ایک انگریز کے ہاتھوں انجام پایا جس
 کی مادری زبان اُردو نہیں تھی ہر چند کہ اس صورتحال کے پیچھے ایسٹ انڈیا
 کمپنی کے مفادات کام کر رہے تھے تاہم بلا واسطہ ہی اس کا فائدہ اُردو زبان
 کے حصے میں گیا انہوں نے اُردو کے بہترین اساتذہ کو ایک مرکز پر اکٹھا کیا اور
 ان کو سادہ و سواں زبان میں کتابیں لکھنے کی ترغیب دی جس کے نتیجے میں
 بارخ دیہار، گنج خوبی، بارخ اُردو، آرائش مہفل تذکرہ گلشن ہند، طوطا کہانی
 قصہ لیلیٰ مجنون، تاریخ مادری، گلزار دانش، گل مغرت اور قصہ گل بکاؤلی
 وغیرہ جیسی بہت سی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ اس فہرست میں بارخ دیہار
 ایسی کلاسکس ثابت ہوئی جو اب تک خواہ کتنا ہے یہ اُردو کی پہلی بلکہ آخری
 کتاب ہے جس کو عام لوگوں میں مقبولیت کا اعزاز ملا۔ آج بھی اس
 کے عوامی نسخے شہروں کی دکانوں اور کتابوں کے کھیلوں پر بکتے ہوئے نظر آتے
 گئے اس وقت تک اُردو کی ایسی کوئی ادبی کتاب موجود نہیں ہے جو اس
 خاصہ سے بازار میں یک رہی ہو۔ مکسٹو والوں کو فورٹ ولیم کالج اور میرامن
 کی یہ بغاوت بہت کھلی چنانچہ کلاسیکی طرز کی مروجہ عبارت آرائی کو ان کھلی
 بحر مترپندوں سے بھائے لکھنے کے لئے مکسٹو والوں میں ایک جذبہ بیدار ہوا
 اور بہت سے اساتذہ ہتھیار بند ہو کر میدان میں آگئے انیسویں صدی میں
 ان اساتذہ نے دلچسپی داستانیں لکھو ڈالیں، اس فہرست میں نمایاں نام
 مرزا رجب علی بیگ سرور کا تھا۔ اسی مؤثر رد عمل کی فضا میں انشاء اللہ خاں
 انشاء نے صرف اپنی ذہانت کا مظاہرہ کرنے کے لئے رانی کیتلی جیسی کہانی لکھی
 جس میں انہوں نے عربی اور فارسی کا ایک بھی لفظ استعمال نہیں کیا اُردو نثر
 میں یہی پہلی ادبی کتاب ہے جو اپنی ہی سرزمین کے قہقے کو موضوع بناتی

ہے۔ اردو کے ادبی نقادوں لسانی ماہروں، تحقیق دانوں اور مورخوں نے اس تناظر میں رائے کی سنگی پر کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔

فورٹ ولیم اور انشا کے بعد ادبی نشر میں ایک اہم موڑ اس وقت آیا جب شاہ میں مرزا غالب نے اردو میں خطوط لکھنا شروع کئے۔ اس سے پہلے دہلی کالج نے اردو نشر نگاری کی روایت کو یقیناً بہت کچھ دیا تھا مگر اس کا دائرہ علم انصاف سے آگے نہ بڑھ سکا۔ غالب کو شروع میں اندازہ نہ تھا کہ وہ جس انداز سے ادبی نشر لکھ رہے ہیں وہ معیار و معنی اور سماجی و تاریخی حوالوں سے بڑی ادبی نشر کا منصب حاصل کرے گی گویا اردو کی بڑی ادبی نشر کا سنگ میل غالب ثابت ہوئے ان کے خطوط صرف خطوط نہیں تھے کہانی اور ڈرامے کے اجزائے بھی مالا مال تھے۔ ان کے ذریعے لکھنے والوں نے اسلوب اور طرز انجہار کی ایک نئی تازہ اور زندہ جہت دریافت کی تھی مرزا غالب نے انشا کو ادبی صنف کا مرتبہ ان ہی خطوط کے ذریعے ملا۔ اردو نشر کی ادبی اصناف میں یہ خطوط ایک نئی دریافت اور تسخیر ہیں ان کے ساتھ زبان کی سادگی اور عجمیت کا وہ رجحان پایہ تکمیل تک پہنچا جس کی دلغ بیل میل امن نے ڈالی تھی زبان کو سماجی عمل کی حیثیت برتنے میں غالب کا نام سرفہرست ہے گویا انہوں نے اردو زبان کو جیسے وہ ہندی کہتے تھے صدیوں کی قید سے رہائی دلا دی اور ان لوگوں میں واپس لائے جن کی گود میں پل بڑھ کر وہ بلوخت کی منزل تک آئی تھی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے لفظوں اور محاوروں کے معاملے میں غلط العوام کو معیار بنایا۔ نسخ اور سودا جیسے اساتذہ کی اصلاح زبان سے ان کو کوٹنے دی گئی نہ تھی اور وہ عام بولے جانے والے الفاظ کو اسی صورت میں استعمال کرتے تھے چنانچہ نمبر کے بجائے ان کی عبارتوں میں لفظ نمبر ملتا ہے دور جدید کے ایک ذہن اور صاحب فکر نقاد انیس ناگی کو صورت یہ حقیقت بہت بڑی لگی کہ آج تک کسی نقاد نے ان کی بڑائی نہیں لکھی چنانچہ ضروری ہے کہ ان کے

برائیوں کو لکھا جائے انہوں نے اپنی کتاب غالب ایک اداکار لے میں ان کے
کو دار اور ایسج کو مسخ کر کے اس آفاقی شاعر کی نہایت بڑھاپہ کی پیش کی ہے
ان کی مجبوری ذاتی کمزوریوں اور معاملات و واقعات کے حوالوں سے ان کے
ادبی و شعری ادبی علمی ادبی شخصیت کا دوسرا جائزہ لیا ہے آزاد منس (Free
Sex) کے بابے میں ان کے نقطہ نظر کو ردِ اجماعی اخلاقیات کے آئینے میں بیان
کرنے کی کوشش بیسویں صدی کے بین الاقوامی اور جمہوری دور میں کوئی اچھی
بات نہیں ہے ان کے خطوط پر رائے ذاتی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غالب نے اپنی
نئی زندگی اپنے معاشقے اور اپنے ازدواجی حالات کو پرکھنا نہیں رکھا۔ علمی و ادبی
مشاغل سماجی عمل کا درجہ لکھتے ہیں۔ غالب اپنے عہد کے نہایت تخلیقی رپورٹ تھے
جنہیں زبان اور شعر و ادب کی سماجی وابستگی کا ابھی طرح احساس تھا انہی زندگی

لے ایس ناگی کی یہ کتاب عشرہ زمیں لاہور سے شائع ہوئی ہے اور اپنی نوعیت
کی پہلی کتاب ہے اس میں مصنف نے کسی حد تک فراڈ کی ٹیکنک تحلیل نفسی
کو غالب کی شخصیت پر منطبق کرنے کی سعی ناکام کی ہے کیونکہ اگر ہم اس ٹیکنک
کے ہتھیار سے خود مصنف کے اندر جھانک کر اصل حقیقت تک رسائی کی کوشش
کریں تو بہت سے ذاتی محرکات (۱۸۵۶-۱۷۸۵) اور انجھاؤ نمایاں طور پر
سمجھ میں آتے ہیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس ردِ عمل کے پیچھے کیا محرکات مصوت
تھا۔ انیس ناگی غالباً اپنے ہیرو کی برتری کو... زندہ دیکھنے کے لئے غالب کی
اس حیثیت کو داغدار بنانا چاہتے ہیں جس کے لئے انہوں نے ذاتی واقعات کو حوالہ
بنا لیا ہے اس باب تک غالب پر لکھی جانے والی تمام تنقید اور تحقیق کو بھی چیلنج کیا ہے
گویا یاد کا غالب سے لے کر آج تک غالب پر جتنا کچھ کہا گیا ہے وہ سخنِ فہمی سے
زیادہ غالب کی طر اندازی پر مبنی ہے اس قسم کی تصانیف کا ایک مقصد یہ بھی
ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر بعض سوالات اٹھائے جائیں اور ان کے جوابات کے لئے
مضبوط جواز پیدا کیا جائے ممکن ہے کہ مستقبل میں یہ سوال منظرِ عام پر آئے کہ غالب
ایک دوسرے ملک کا شاعر ہے چنانچہ اس کو یہاں سے دیس نکالا دیا جائے۔

معاشقہ اور ازدواجی حالات ذاتی مددک تو ان کے لئے ضرور اہم تھے لیکن دوسروں کے لئے ان کی معنویت نہ ہونے کے برابر تھی۔ فیض نے ان کی شخصیت کے اس رخ کو بڑے سلیقے سے واضح کیا ہے۔

غالب تو اپنے دور کے غم بیان کر رہے تھے جس جہد میں وہ لپکتے تھے جو ان کا معاشرہ تھا ان پر جو گزند ہی تھی وہ سب سامنے معاشرے کا دکھ درد اس جہد کا تجربہ اور تجربہ کا درد بیان کر رہے تھے۔ غالب کے یہاں داخلی اور ذاتی طریقہ کار میں سماجی احساس کا عنصر بھی ملتا ہے اس لئے ان کا کلام تنگ نظری اور اپنی ذات تک محدود ہونے کے بجائے کل سماج کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

یہ دئے ان کے خطوط پر بھی منطبق ہوتی ہے مگر ایک ایسے قلم کار کو کیا کہیں جو بہ یک نظر فیض کو پابلو زردا کے مقابلے میں پونا قرار دے۔ یہ وہی غالب والی بات ہے کہ دشمنی کے لئے بھی ہم فتنی ضروری ہے خطوط غالب میں نجی زندگی معاشرے اور ازدواجی حالات نہ ہونے کے باوجود ایک ماہر جاسوس کی طرح انہیں ناگی نے ان معاملات کے بارے میں ساری معلومات جمع کر لی ہیں وہ انہی کے غالب شکن بننا چاہتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ جس جہد میں وہ زندگی کر رہے تھے اس کی ایک جامع سیاسی و سماجی، تہذیبی و علمی، فکری و ادبی اور اقتصادی و سائنسی خاکہ نگاری ان مراسلات میں ملتی ہے اور جمہوری و سائنسی انداز نظر کے حق میں ان کے دئے ان عبارات میں موجود ہے ممکن ہے کہ انیسویں صدی کے کسی گوٹ یا گورڈر میں اس دور کی اشیائے صرف کی قیمتوں کا ذکر نہ ملے مگر خطوط غالب کے ذریعے یہ فہرست دستیاب ہے حقیقت نگاری اور سماجی مقصدیت کا جو نظریہ بیسویں صدی میں شعروادب کا موضوع بن رہا ہے اس کے بہت سے رخ ان خطوط میں دکھائی دیتے ہیں کیونکہ یہی ان کا مسلک بھی تھا۔ علم و ادب، تحقیق و جستجو، فلسفہ فکر، تمدن و معاشرت اور تاریخ و عقیدہ کے نہ جانے کتنے پہلو ان کے یہاں موجود ہیں اس طرح انڈو کی ادبی نثر کو انہوں نے ایسا انقلابی رخ دیا جو اس سے پہلے

نایاب تھا ان کا طرز بیان قدیم مروجہ انداز سے انحراف پر مبنی ہے۔

غالب کا حمد تنقید بھی بے خبری کا عہد تھا۔ اُنکو تنقید ایک ادبی صنف کی حیثیت سے اس وقت پیدا ہوئی جب حالی نے مقدمہ شعر و شاعری بمبیس کتاب لکھی لیکن غالب کے غلوں ان کے بعض دیباچوں اور اشعار میں سائنس تنقید کی جہتیں نمودار ہو چکی تھیں جس کا اندازہ اس مختصر سی عبارت سے ہوتا ہے جو انہوں نے مرید کی خواہش پر تقسیم آئین اکبری کے لئے لکھی تھیں۔ یہ عبارت سائنس تنقید کی اصولیات پر پوری اُترتی ہے اس حوالے سے یہ کہنا ہے جاظر فاری نہ ہو گا کہ دعاؤ دو میں سائنس تنقید کا ابتدائیہ بھی ہیں اور یہ ایک ایسا آفاق افراد ہے جو محض ادب کے بعد سب سے پہلے غالب ہی کے حصے میں آیا ہے ان کی ادبی نشر کے اس زائیدے کی طروت بھی ہمارے فاضل نقادوں نے زیادہ توجہ نہیں کی ہے انہوں نے ادبی تاریخ میں پہلی بار پورے اختلاف کے ساتھ برہان قاطع کی عقلی معنوی کمزوریوں کو گرفت میں لیا جو کہ علم زبان پر ان کی ماہرانہ دسترس کا ثبوت ہے ان کے لئے ایک ایسے کوچے میں قدم رکھنا جہاں تک رسائی اُن کے عہد میں کم و بیش ناممکن تھی کیونکہ اس زمانے کے اساتذہ اور علماء اختلاف نظر اور مروجہ نظریات سے مختلف انداز کو خوش آمدید کہنے کے لئے قطعی راضی نہ تھے۔ بجائے خود غیر معمولی کارنامہ تھا جدید سائنس تنقید جس تہذیب کی گود میں پر دان چڑھائی ہے وہاں آزاد سی تحریر و تقریر اور اختلاف ملنے انسانی حقوق کی ہرست میں شامل کی جا چکی ہے۔ غالب نے اپنے عہد میں تہذیب نقد و نظر کی بھی پاسداری کی اور بڑے نقاد کے منصب کو بھی بڑے سلیقے اور حوصلے سے نبھایا۔ معمولی قسم کے اعتراضات کو نظر انداز کرتے رہنا بدگوئی و بدکلامی سے گریز اور انتہا پسندانہ رد عمل کو درگزر کرتے رہنا ان کا شیوہ تھا۔ قاضی صاحب بڑودہ کے اعتراض پر ایک دوست کو لکھتے ہیں کہ "قاضی صاحب بڑودہ کو مداف دیکھو۔ میں برا ہوں تو اس نے سچ کہا ہے اگر میں اچھا ہوں تو اس نے برا کہا ہے تو

اس کو خدا کے حوالے کر دو۔

انہیں ناگنی نے جو غالب کی زندگی کے ہر واقعہ سے ان کے کردار کو مسخ کر دینے کا کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ لیتے ہیں۔ قسطل سے ہونے والی معرکہ آرائیوں میں بھی ان کو ملوث کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ قاتل شعری حیثیت اور فنی و معنوی معیار کے اعتبار سے بہت چھوٹے طبقے کا شاعر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل زبان فارسی داں ہرات کے سفیر نے ان معرکوں میں غالب کی فاداسی شانوں کے حق میں لپٹے دی تھی۔

اعترافات کے معاملے میں غالب کا رویہ بہت مہذب اور محتاط رہا۔ مولوی امین الدین کی گالیوں کا ذکر آیا تو ہر جہت ایک خط میں لکھا: اگر گدھا کسی کو لت ملے تو کیا تم بھی اس کو لات مارو گے؟

البتہ جہاں دلائل سے گفتگو کا موقع آیا انہوں نے کسی تکلف نہیں کیا۔ ان کی دوست فکر و علم کا یہ معیار تھا کہ جہاں کوئی اعتراض انہیں صحیح محسوس ہوا اس کو تسلیم کر لینے میں عجز نہ کیا۔ ان کو کبھی آرٹے نہیں آنے دیا۔ ناطق مکرانی نے ایک فارسی شعر پر اعتراض کیا تو سمجھا ادا انہوں نے نہ صرف اس کو تسلیم کیا بلکہ شعری تقبیح بھی کر لی۔ اس حوالے سے بھی غالب کے خطوط کی افادیت مسلم ہے کیونکہ ان کی عبارت میں جدید سائنسی تنقید کا تسلسل نمایاں دکھائی دیتا ہے انہوں نے اپنے جہد کے ثقافتی ماحول میں تاریخی ادبی اور علمی مفاہیم کا جائزہ تنقیدی تناظر میں لیا ہے اور اس اعتبار سے کوئی برے سے بڑا سامان ان کے قدم قامت کو چھو کر نہیں گزرا ہے۔

اسد کی ادبی فہرست ہر پہلو سے غالب کے ہاتھوں ایک ایسی کلیت (Totality) اور بلندی تک آگئی جو تاریخ کے ایک مرحلے کو مکمل کرتی ہے اور دوسرے مرحلے کے لئے زرخیز زمین تیار کرتی ہے جس کی سطح سے سرسبز اردو ادب کے عناصر جنم لیا۔ اردو ادب کے ان عناصر خمسہ کے یہاں

غالب کے شعور کی روشنی کا منظر بہت واضح ہے اردو کی ادبی نشر کے حوالے سے غالب کا از سر نو مطالعہ امکانات کی ایک نئی تلمذ تک رسائی کا سفر ثابت ہو سکتا ہے۔

غالب کے طرفدار

مغربی ادب اور تصور پسند فلسفہ کے زیر اثر اُردو شعر و ادب کا جائزہ قلب بند کرنے والوں میں ایک اہم لیکن گمنام ڈاکٹر عبدالرحمن بیہنوری کا بھی ہے۔ انہوں نے محاسن کلام غالب پر کہیں جو عالمانہ تاثراتی مقالہ لکھا تھا وہ حوالہ جاتی اور تاریخی اعتبار سے اہمیت و افادیت رکھتا ہے۔ ان کو مغربی ادب اور تصور فلسفہ پر عبور تھا جس کے لئے یہ مقالہ بھلے خود دلیل ہے لیکن ان کی مجموعی تحریروں میں انگریزی زبان و ادب اور علوم و فنون سے مرعوبیت کی وہ بدعنائی نہیں نظر آتی ہے جو ہمیں کلیم الدین احمد ڈاکٹر احسن فاروقی، اور محمد حسن عسکری کے یہاں ملتی ہے۔ بیہنوری اور فرائض مغربی زبان اور شعر و ادب پر قدرت رکھنے والے ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے مشرقی تہذیب و شعریات اور ادبیات کی جمالیاتی و ثقافتی اور تاریخی و معنوی بلند یوں کے نامعلوم گوشوں کو مغربی شعر و ادب کے حوالوں سے بے نقاب کیا ہے۔ کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر احسن فاروقی جیسی سطحیت ان دونوں کے یہاں ہی ہے۔

سنار و لبقا میں مغلوب ہو کر ایشیائی ایسے مرعوب ہو گئے ہیں کہ اپنے ہر فعل و خیال کا موازنہ مغربی اقوال و آراء سے کرنے لگے ہیں یہ وہ غلامی ہے جس کی زنجیروں کو تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی۔ پس کیا تعجب ہے اگر اس یورپ زدگی کے زمانے

میں طالب علم اور انگریزی تعلیم یافتہ مرزا غالب کا شکریہ

(Shakespeare) در دس در تھ (Words)

(worth) اور ٹینیسن (Tennyson) سے مقابلہ

کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ افسوس یہ کوتاہ نظریہ نہیں
جانتے کہ شاعری اور تنقید پر کیا دانستہ علم ہوتا ہے۔

• محاسن کلام غالب: جیسا اہم مقالہ اپنی کلاسیک اور تاریخت کی وجہ
جسے اب محض ایک تبرک کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور اس کی صرف اتنی ہی
اہمیت باقی رہ گئی ہے کہ وہ یونیورسٹیوں کے نصابات میں موجود ہے تاہم اس
مقالے میں ایسی تخلیقی قوت اور معنوی جہتیں موجود ہیں جن پر دور حاضر
کے علمی حوالوں سے مزید بحث کی جاسکتی ہے خصوصاً نام ہندو جدیدیت کے رجحان
سے تعلق رکھنے والے حلقوں کے لئے تو یہ افسیر کا حکم رکھتا ہے۔ معلوم نہیں کہ
ہمارے فاضل نقادوں اور ادبی نظریہ سازوں نے ایسی اہم دستاویز کو کیوں
نظر انداز کر دیا ہے اس مقالے کے مدد جات سے اختلاف کی یقیناً بہت گہرائش
ہے لیکن مصنف کی تخلیقی قوت اس کے انداز بیان اور تائثراتی جہت سے انکار
نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جدید تنقید میں تاریخی، سائنسی، نفسیاتی اور تائثراتی اور
دیومالائی مکاتب کی ترتیب و تنظیم مدعی حاضرہ کی دین ہے ان میں دیومالائی
مکتب سنہ ۱۹۵۰ء کے بعد زیادہ نمایاں ہوا خصوصاً برصغیر ہندوستان میں اس
کے اثرات زیادہ محسوس کئے گئے کیونکہ مغرب میں یونان اور مشرق وسطیٰ میں مصر و
شام کے بعد یہی وہ خطر زمین ہے جو دیوالا کا سرچشمہ رہا تھا اور جس کو
تہذیبی سرشت میں اس کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں برصغیر پر اس کی
اثرات میں اس کی تہذیبی و تاریخی سرشت میں کوئی تبدیلی نہ پیدا کر سکے بلکہ خود سلاطین
انکار و نظریات نے دیومالائی اثرات سے استفادہ کیا۔

عبدالرحمن بجنوری نے تنقید کا صرف ایک ہی شاہکار چھوڑا تھا جو محاسن

کلام غالب کے عنوان سے کبھی نسخہء حمید ص ۱۰ کے صفحات پر شائع ہوا تھا۔
 انجمن ترقی اردو حمید آباد نے اس کو کتابی صورت میں شائع کیا تھا اس کے بعد
 "محارس کلام غالب" دوبارہ شائع نہیں ہوا البتہ ۱۹۶۹ء غالب صدی کے
 موقع پر رسالہ افکار کراچی نے اس کا متن شائع کیا اور اسی سال فخری پریسنگ
 پریس کراچی نے اس کو ٹائپ بر کتابی صورت میں شائع کیا۔

ڈاکٹر بنوری نے اپنے تشریحی بیان میں سائیکل انجملو اور لیونارڈ کے حوالوں
 سے استفادہ کیا ہے جن کے اخراجات ان کی تقریر میں ظاہر ہوئے ہیں اور اس
 حوالے سے وہ تاثراتی فلسفہ تنقید کے بانی کرچے سے قریب آجاتے ہیں۔ "محارس
 کلام غالب" کا اسلوب اور معنوی جہالت کی تلاش میں کرچے کی اصولیات کا
 پس منظر موجود ہے جو کراچی سوہی صدی کے اس ماحول میں پانچڑھا احتجاج
 جرمن فلسفہ تعصوبیت اور ہیگل کو روح عصر کا مقام حاصل تھا کرچے ۱۸۶۶ء
 میں پیدا ہوا تھا اور جب وہ سن شعور کی منزل پر پہنچ کر افکار کی دنیا میں آیا
 اس وقت جرمن تعصوبیت اور ہیگل کے مانگیزا فرائٹ کارل مارکس اور اینیبلز کے
 افکار و نظریات کی زد میں آگئے تھے۔ مارکس تاریخ و جدلیاتی مادیت نے ہیگل
 کے نظام افکار کو پیروں کے بل پر کھڑا کر دیا تھا شعر و ادب فلسفہ و فنون اور
 تاریخ کی قلمرو میں مارکسی نظریات نے بڑا انقلاب برپا کر دیا تھا۔ کرچے کی کتا
 ۱۰ ایسٹھٹکس (Esthetic) مطبوعہ ۱۹۰۲ء اس رد عمل ہی کی تخلیق
 خلی اس نے لکھا کہ آرٹ مابعد الطبیعیات اور سائنس پر فوقیت رکھتا ہے
 سائنس آگہی فراہم کرتی ہے جب کہ آرٹ جن کی تخلیق کرتا ہے علم اس کے نزدیک
 دو جہتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: وجدانی اور منطقی، علم جو تعمیل سے آگہی حاصل
 کرتا ہے آرٹ ہے اور جو عقل کو آگہی کا سرچشمہ تسلیم کرتا ہے سائنس ہے۔ آرٹ
 کی دنیا امید ساز کی دُنیا ہے اور اس پر تعمیل کی حکمرانی ہوتی ہے۔ آرٹ کا
 منصب معروضات کی جماعت بندی اور تعریف و پش کرنا نہیں ہے بلکہ محسوسات

کا اظہار ہے۔ حسن ایک ایسا ایسی ہے جو تخیل بناتلے ہے اور یہی ایسی اصداک میں آنے والے معروض کی ماہیت سے آگاہ کرتا ہے۔ حسن کا شعور ہی داخل کے اظہار کا محرک ہوتا ہے اور ہم اشیاء کو براہ راست وجدانی تجربے سے محسوس کر لیتے ہیں جب ہم آئٹ کے کسی شاہکار سے لکھتے اندوز ہوتے ہیں تو دراصل ہم اپنے ہی وجدان کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔ عبدالرحمن بجنوری جب کہتے ہیں کہ "کوئی نغمہ ہے جو اس ساز زندگی کے تاروں میں بیدار یا خواہیدہ موجود نہیں ہے تو ہمیں یہی صورت محسوس ہوتی ہے۔ کونچے کی طرح وہ بھی تقسیم کے قائل نہیں ہیں اور لکھتے ہیں کہ شاعری کو اکثر شعر نے اپنی اپنی حد تک گاہ کے مطابق حقیقت اور مجاہدہ اور وجدان، ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے مگر یہ حقیقت خود ان کی نارسائی کی دلیل ہے۔ شاعری انکشاف حیات ہے جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں شاعری بھی اپنے اظہار میں لائقین ہے؟" انیسویں صدی میں تاثریت نے فرانس کو مزور متاثر کیا لیکن اس کی مرکزیت کا اثر جرمنی ہی کو حاصل رہا۔ بجنوری کے یہاں بھی جرمن تاثریت کا شعور عادی ہے جہاں میکس لبرمین (Max Liebermann) اور لوس کورنٹھ (Lova Corinth) اس کو فروغ دینے میں پیش پیش تھے اور گستاؤ کلیمٹ (GUSTAN KLIMT) اس کی سرپرستی کر رہے تھے فرانس میں یہ اسلوبی تحریک معنوی اور مجسمہ سازی پر زیادہ اثر انداز ہوئی مکونیت (Cubism) اس اثر کا نتیجہ تھی۔ جرمن تاثریت پسندوں نے اظہاریت کے مقابلے میں ہیئت کو کوئی اہمیت نہیں دی جیکے فرانسیسی اہل قلم نے ہیئت کے تجربوں کو اولیت دی۔ عبدالرحمن بجنوری نے بھی "محاسن کلام غالب" میں ہیئت سے بحث نہیں کی ہے اس مقالے کے ابتدائے (Prologues) ہی سے تاثریت کا وہ بہاؤ شروع ہو جاتا ہے جو آخری حد تک بغیر کسی نوٹس کے جاری رہتا ہے۔ یہ عبارتیں وحدت تاثر و عمل کی نشاندہی کرتی ہیں۔

بحال الہی ہر شے میں رونما ہوتا ہے۔ آفرینش کی قدرت جو ممتا
باری میں سے ہے خاص کو بھی ارزائی کی گئی ہے جہاں ملائکہ کا رہنا
ایزدی میں پوشیدہ حسن آفرینش میں مصروف ہیں شاعر یہ کام
علی الامکان کرتا ہے۔

اس لحاظ سے مرزا کو ایک سب النوع تسلیم کرنا لازم آتا ہے
غالب نے ہر مہستی میں جو فالو اس خیال روشن کیا ہے
کون سا پیکر تصویر ہے جو اس کے کاغذی پیراہن پر
منازلِ زمیت قطع کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔

• محاسن کلام غالب کا تاثراتی اسلوب ظلفہ و فکر اور معنی و مباحث کی
جزئیات سے اتنا عاری نہیں ہے جتنی کہ مغرب کی تاثراتی تنقید نظر آتی ہے
اس طرح دیکھیے تو موازنہ تشریح اور فکریات کی مباحث بھی مقالے میں
سمٹ آئے ہیں لیکن یہ کسی بھی طرح تاثراتی اسلوب کی یکسانیت کو مجروح
نہیں کرتے ہیں اور یہی مقالے کی جامعیت اور خوبصورتی میں اضافہ بھی
کرتا ہے۔ عبدالرحمن بجنوری بلاشبہ غالب کے مداح ہیں لیکن یہ مداحی
بے دلیل نہیں ہے گو کہ دلائل کا تعلق ان کے اپنے نظریہ حیات سے ہے
جو جرمن و فرانسیسی تصور پرستی پر مبنی ہے۔ انہوں نے جدید سائنسی نظریات
سے بھی استفادے کی کوشش کی ہے یعنی وہ نظریات جو ان دنوں زیادہ مقبول
تھے تاہم ان نظریات پر بھی انہوں نے مابعد الطبیعیاتی فضا کی چادر ڈھانپ
دی ہے اور ان میں سے کچھ اکثر نظریات بڑی تبدیلیوں سے دوچار ہوئے ہیں۔
بجنوری نے مغربی شاعروں اور فلسفیوں کے لئے زیادہ ناموں کو موضوع بنایا
ہے جو بحث کے توازن میں معنویت پیدا کرنے کے بھلے سے رجلی اور عیشہ
ضروری خیال آرائی کے دامن کو وسیع کر دیتے ہیں غالب کے تخلیقی آرٹ
اصلاحی کار و نظریات کی ان مغربی فلسفیوں اور شاعروں سے مطابقت کوئی

مزدوری موضوع ہنر، ان سکتا ہے یہ مطابقت ممکن ہے کہ بعض اتفاقی ہو
 ورنہ غالب اور مغرب کے لیکن فن و فکر بعد ہی کے امکانات زیادہ ہیں اور یہ بعد
 ہونا ہی ان کی عظمت کی ضمانت ہے کیونکہ مشرق و مغرب کی تاریخی لسانی
 ثقافتی اور مذہبی و مابعد الطبیعیاتی دنیا میں نہ صرف مختلف بلکہ یکسر متضاد
 ہیں ایسی صورت حال میں شاعر کا مقابلہ شکست پر، ٹپنی سن، وڈس وڈس،
 ہائی ریش ہینے، گوٹے، پال ورلین، رمباؤ، ملانت، بادیر، مام برٹ
 اسپنوزا، ہیگن، برگسان ڈارون برکے، فیسے دھیرہ سے کرنا بے معنی ہے مرزا
 غالب کے شعر سے

گر نہ اندہ شبِ فرقت بیان ہو جائیگا بے تکلف، داغِ ہمد مہر وھاں چو جائیگا
 کا مقابلہ وڈس وڈس کے ان شعروں سے۔

O mercy to myself I cried
 'if Lucy' should be dead.

ہیں کیا جاسکتا، ان میں نہ تو کوئی لفظی مناسبت ہے نہ موضوع کی اور نہ
 اسلوب اور نفساکی۔ اسی طرح ان کے چند اشعار کا پال ورلین کی نظم سے مقابلہ
 بھی محض مبالغہ ہے۔

پال ورلین (Paul Verlaine) کی مشہور نظم میرا
 خواب (Mon Reve Familien) مرزا کے مفصلہ ذیل قطعہ
 سے کس قدر مشابہ ہے۔

نشر ہا شاو اب رنگ و ساد ہا مست طرب

شیشے سے سرو سبز جو تہا نغمہ ہے

ایسی کئی مثالیں اس مقالے میں موجود ہیں جن کی معنویت وجہ نزاع
 بن سکتی ہے۔ بیسویں صدی کی پہلی نصف دہائی کے بعد مغربی شعرو ادب
 اور فلسفہ و افکار کے حوالوں سے استفادہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں سمجھی

ہا سکتی ہے کیونکہ دنیا کے مختلف خطے اس دور میں ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب آ گئے ہیں ذرائع ابلاغ نے ان کے درمیان روابط کے مسئلے کو آسان بنا دیا ہے اور مختلف زبانوں میں تراجم کے ذریعے انکار کی ترسیل بہت تیز ہو چکی ہے چنانچہ اہل مغرب اور اہل مشرق دونوں ہی ایک دوسرے کے اثرات قبول کر رہے ہیں۔

۱۰۔ ماسن کلام غالب کا منظر فصاحت و بلاغت اور عروض سے شروع ہوتا ہے مصنف نے ان تینوں حوالوں سے غالب کی یکتائی کے لئے خواہ تلاش کیلئے تاہم لسانیات کی سائنس کے اعتبار سے یہ مطالعہ نا کافی اور تشنہ ہے بحور و اوزان کی اہمیت اپنی جگہ صحیح ہے لیکن غالب نے شعری زبان کو ویدائی ٹیکنک سے ہٹ کر سماجی عمل کی حیثیت سے استعمال کیا ہے اور بعض شعروں میں ایسے الفاظ دیدہ و دانستہ استعمال کئے ہیں جن کو ان کے عہد کا شعری مزاج مبتذل اور غریب تصور کرتا تھا البتہ اردو شاعری کی تنقید نے اس حقیقت کی طرف یقیناً کبھی نظر نہیں ڈالی کہ عروض کا مدعا اس موسیقی کی طرف سامع کا رہنمائی کر لے جو قالب شعر کو اپنے دخل سے زندہ کرتی ہے۔ اردو شاعری نے فن موسیقی کو کبھی اپنا رہنما نہیں بنایا جبکہ ہندی شاعری کی اساس کلاسیکی سُرور پر تھی جیسا کہ خسرو کے یہاں ہے برصغیر کے شمال مغرب میں سندھ اور پنجاب کے بعض صوفی شاعروں نے بھی شاعری کی تنظیم میں موسیقی کے سُرور کا خیال رکھا ہے خصوصاً شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے تو کئی ہندی کلاسیکی سُرور میں شعر کہے ہیں۔ ان معنوں میں مرزا غالب کی شاعری کا بھی فن موسیقی سے کوئی براہ راست رابطہ نہیں بنتا ہے۔ اگر اپنی حیثیت سے غور کیا جائے تو دیوان غالب کی کتاب ہے۔ بلاغت میں تعیل الفاظ بلا اختلال معنی اس سے زیادہ ممال کہیں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس کو پر کن کہا جاسکے قصاً

کی یہ کیفیت ہے گویا دیلئے لطافت، رواں ہے۔

اگر بوطیقہ کی رو سے غما کیا جائے تو یہ کتاب اپنا جواب آپ
ہے شعر کی بنیاد عروض پر قائم ہے عروض موزونیت کی میزان
ہیں الفاظ کے تولنے کا نام ہے نقطہ تعدیل کو پانے کے لئے صدا
ناگ سے نازک اعداد گراں سے گراں اوزان سے کام لیا جاتا ہے
اور یہ اوزان شاعری نے موسیقی سے مستعار لئے ہیں کوئی آسان
سے آسان اور مشکل سے مشکل بحر ایسی نہیں جس میں مرزا نے
کلام موزوں نہ کیا ہو۔ جہاں ان کے یہاں وہ بھری ہیں جو خط
مستقیم سے مائل ہیں وہیں وہ بھری بھی موجود ہیں جن کے
صورت اندازے تقلید سے خطوط متعین اور دوائی سے مشابہ ہے
جہاں رواں بھری موجود ہیں وہیں افتاں و خیزاں بھری بھی
ہیں مثلاً۔

کہتے ہیں ہم نہ دیں گے دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مدعا پایا

گاہ گاہ ہستی میں لالہ داغ سالن ہے
برق خرمین راحت خون گرم دہتاں ہے

اگر میری جہان کو سزا نہیں ہے
طاقت بیداد انتفسار نہیں ہے

عجب نشاط سے بلا کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایہ سے سرواڑے سے بچے قدم آگے
بہت سے شعراء جن میں استاد شامل ہیں عروض کو شعر کے
تککیل کے لئے کافی خیال کرتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ عروض کا
مدعا اس موسیقی کی طرٹ سامع کو رہنما کرتا ہے جو قالب شعر کو

کہتے ہیں مدیں گے ہم۔

اپنے دخل سے زندہ کرتی ہے۔ اگر شعرا زروٹے مفاہیلین مفاہیلین
مفاہیلین درست ہو لیکن آہنگ تشدد جائے تو خام ہے۔ ایسا
شعر مثل ایک آئینہ کے ہے جو گلشن سے سالم اور درست باہر
آئے لیکن حقیقت سے محروم ہے۔

مرزا غالب کے لئے شاعری موسیقی اور موسیقی شاعری ہے
یہی باعث ہے کہ دیوان کا ہر مصرع تار و باب نظر آتا ہے اور
رمل میں فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن ایک ہنایت متعل
بھر ہے الفاظ ہنایت آسانی سے اس کا جامہ قبول کر لیتے ہیں۔
شعرا نے اردو اکثر اس کو کام میں لاتے ہیں لیکن عیب اس
میں یہ ہے کہ مصرعوں میں رقص صوفی کم پیدا ہوتا ہے مثلاً یہ
فارسی کا شعر :-

ہر کہ خواہد گو بیاد ہر کہ خواہد گو برد ۱۱

گیر و دار عاجب و دربان ہیں درگاہ نیست

جو وصل و ترکیب کی بیش بہا مثال ہے۔ باوجود اُستاد کی کاوش

و کاوش کے معیار رسا نہیں ہوا اس کے مقابلے میں یہ ترانہ
ریز شعر ملاحظہ ہو۔

ہم نشیں مت کہہ کہ ہر ہم کہ نہ بزم عیش و دہشت

داں تو میرے نالہ کو بھی اعتبار لغت ہے

غالب کے شعر کی موسیقی کی خوبی بلا امداد ساز و ترانہ کے تریل

سے دریافت ہو سکتی ہے۔

مید الرحمن مجنوری کا دعویٰ کہ گوٹھے اور غالب پر شاعری کا خاتمہ ہو گیا۔

ہے ہر پہلو سے ہنایت خیر علی خیال ہے یہ خیال بجائے خود اس اصول ارتقا
کے خلاف ہے جس کی وکالت مصنف نے بڑی شد و مد کے ساتھ کی ہے اور

یوں ان کے اپنے فکر میں تضاد پیدا ہو گیا ہے۔ اگر جذبات عقیدت سیاسی مفادات اور علاقائی تناظر سے ہٹ کر غور کیا جائے تو غالب و فیض کے مقابلے میں اقبال کی حیثیت ذرا کم ہی محسوس ہوتی ہے غالب کی نظر اندرونی کیفیت کے مشاہدے سے بیرونی کیفیت کا قیاس کرتی ہے، بہت کمزور تجربہ ہے۔ ان کے اکثر اشعار اس کے برعکس ہیں، انہوں نے تو اشیائے خارج کو بطور معروضہ دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس حوالے سے اشعار و معروضات کی ماہیت کا سراخ لگایا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ سائنسی نتائج سے زیادہ قریب تر نظر آتے ہیں۔

ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی مگر کھلا
 ہر چند ہر مشاہدہ حق کی گنگو جنتی نہیں ہے بادہ و ساحل کچھ بخر
 کافے کافے منت ہائے نہائی زہرا صبح کو ناشام کا لانا ہے جوئے خیر کا
 ان کے علاوہ کہتے ہیں اشعار اس حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں کہ غارِ کج کا
 مشاہداتی عمل ہی ان کی فکر کا پہلا حوالہ ہے۔ زبان یقیناً ارغوی ہے لیکن
 شانوارہ خیالات سماوی نہیں ہیں، اس منزل پر معتقل بڑی شوگر
 کھائی ہے۔ اقبال راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے باوجود وجدان کو الہامی
 رابطہ تسلیم نہیں کر سکے اور اس کو ذہن کی ایک مفصّل اعلیٰ تر صلاحیت ہی
 سے تعبیر کرتے تھے۔ اُردو شعر و ادب کی تاریخ میں مالی پہلے نقاد تھے جنہوں
 نے پہلی بار خیال کو ماننے کی پیداوار کا کھاسخا، غالب نے تنگنائے غزل کسے
 بات جس حوالے سے کی تھی وہ عبدالرحمن بجنوری کے خیال سے مختلف ہے وہ جو
 کچھ لوگوں سے کہنا چاہتے تھے ان کے عہد کی مشغی لغت اور کلاسیکی حدیث کا
 اس میں رکاوٹ پیدا کرتی تھیں اور اس سے جو انجمن جنم لیتی تھی تنگنائے
 غزل کے شکوے کا سبب بنی حالی ہی کو کسی بھی مشکل و پریشانی سے
 کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں

غالب کی شکل پسندی کا دفاع بھی انہوں نے ذرا مبالغے کے ساتھ کیا ہے۔
 دیوان غالب میں ایسے اشعار بھی ہیں جن کا مفہوم پلنے سے
 ذہن مطلقاً قاصر ہے تخیل حرمۂ ارکان میں ہر جانب پرواز کے
 بعد مجبور واپس آیا ناپ ہے گویا ایک دائرہ ہے جس سے گریز ناممکن
 ہے بہت سے نقاد اس کو کیفیت خرابا پر محمول کرتے ہیں۔ ایسا
 نہیں ہے۔ گوئٹے کے اعلیٰ ترین کلام پر جوفادوسٹ (عقہ دم)
 میں ہے یہی اعتراض ہر جانب سے کیا گیا تھا ایک دن
 ایکermann) نے گوئٹے (Goethe)

سے دریافت کیا کہ اس اشکال کا کیا باعث ہے ؟

مابعد الطبیعیاتی اور تقویری فلسفے نے حیرت و ہراس راریت کے مسئلے کو
 انگشتان حقیقت کے خلاف موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ چنانچہ انیسویں
 صدی کے انگریزی و فرانسیسی شعراء و ادیب نے فطرت پرستی و رومانیت اور پراسرار
 کوجالیاات کے تانے بانے میں پیش کر کے سائنسی حقیقت پسندی کے خلاف ایک
 مہم شروع کی جو مکمل ناکامی پر منتج ہوئی۔ محاسن کلام غالب کے فاضل مصنف
 نے گوئٹے کے حوالے سے اس غیر سائنسی تصور کو حقیقت کے معنوں میں پیش کرتے
 ہوئے غالب کے مہم اشعار کو کمالِ فن کے مترادف قرار دیا ہے۔ بیسویں صدی
 میں نام نہاد حلقہ جدیدیت نے بھی ابہام اور تجربہ پرستی کے دفاع میں اسی قسم
 کے دلائل سے کام لیا ہے اور اس معیار کی پذیرائی کی ہے کہ خیال کا جنم سے
 بالا تر جو ناہی کمالِ فن ہے۔ سمجھوری کہتے ہیں۔

گوئٹے نے جواب دیا یہی تارکی ہی تو ہے جس پر لگ فرغیتہ ہیں
 لوگ ان مقامات پر لایمحل مسائل کی مثال حذر کرتے ہیں اور اپنی
 ناکامیابی سے نہیں اکتاتے۔ انسانی طلب کی انتہا تخیل ہے اگر کسی
 فعل سے حیرت پیدا ہو تو وہ کمالِ فن ہے اور اس بات پر اصرار نہ

کرنا چاہیے کہ اس کے پس پشت کیا ہے لیکن بچے جب آئینہ میں اپنا عکس دیکھ کر حیران ہوتے ہیں تو نادانی سے پشت آئینہ کو بھی دیکھنے لگتے ہیں۔

غالب کی شعر گوئی میں لفظوں کے استعمال جیسے موضوع پر بحث البتہ مفید اور مثبت ہے۔ اس مرحلے میں انہوں نے زبان کے ارتقاء کی اس حقیقت کا اعادہ کیا ہے جس کی بنیاد سائنس پر استوار ہے یہ بات یقیناً صحیح ہے کہ اگر یہ تجدید عہد بہ عہد نہ ہوتی ہے تو زبان کہنا اور پارینہ ہو جائے گی۔

زبان ارتقاء کی پابند ہے۔ الفاظ سببان نہیں بلکہ زندہ ہیں گو منطق کے قواعد تبدیل ہیں۔ تصورات بہرہ ور وقت تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور چونکہ تصور کے زبان سے ادا کرنے کا نام ہی لفظ ہے۔ الفاظ بھی تغیر کا تقاضا رکھتے ہیں اگر یہ تجدید عہد بہ عہد نہ ہوتی ہے تو زبان کہنا اور پارینہ ہو جائے زبان کی تجدید مذہبی یا تمدنی اصلاح سے آسان نہیں جس طرح رواج پر غالب آنا مشکل ہے محاورے کا مٹانا بھی مشکل ہے بہت سے ادیب اس کیلئے غافل ہیں کہ خوب سے خوب محاورہ بلحاظ عمر آخر ضعیف ہو کر بے جان ہو جاتا ہے چنانچہ اردو میں اس وقت بہت سے محاورے ہیں جو حقیقت ہیں الفاظ اور فقرات کی ”میاں“ ہیں مرزا نے اپنے دیوان میں محاورے کی بندش سے اکثر احتراز کیا ہے تمام دیوان میں مشکل سے دس اشعار ایسے ہیں جن میں کوئی محاورہ باندھا ہے۔ مرزا کی شاعری دلی کی گلیوں یا مکشوں کے کوچوں کی پابند نہیں بلکہ آزاد اردو زبان ہے، جب مرزا نے اپنے فلسفیانہ خیالات کے لئے سوزوں الفاظ کی تلاش کی تو اردو کے ذخیرہ الفاظ کو بہت محدود پایا۔ لیکن قاعدہ ہے کہ جہاں نیا خیال پیدا ہوتا

• ہے وہاں نیا لفظ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر جان اپنا جسم خود
ہمراہ لاتی ہے۔

• نئی لسانی تشکیلات کے مہنوا مانج زبان سے مطئن نہیں ہیں ان کا دہم
ہے کہ رائج زبان عصر حاضر کی فکری پیچیدگیوں کا اظہار میں مانع ہے کیونکہ
اس کی لغت میں وہ الفاظ نہیں ہیں جن کی مدد سے ان پیچیدگیوں کو اسی
صورت و معنی کے ساتھ پیش کیا جاسکے جو واقعی ہیں اس مقصد کے لئے اضافہ
ہمناؤں نے زبان کو توڑ پھوڑ کر ایک نئی لغت بنانے کی کوشش کی۔ اس قسم کی
مہم جوئی ظاہر ہے کہ بے معنی سی چیز ہے زبان کا براہ راست تعلق حوام سے
ہوتا ہے اسکی تشکیل و تخریب حوام ہی کے ذریعہ ہوتی ہے اور یہ فطری عمل
بہت آہستہ اور غیر شعوری ہوتا ہے۔ حالات کے تقاضے نئے الفاظ کو خود جنم
لے جتے ہیں اور اس اصول کو سند فراہم کرتے ہیں کہ جہاں نیا خیال پیدا ہوتا ہے
وہاں نیا لفظ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے ہر جان اپنا جسم خود ہمراہ لاتی ہے۔
مثالاً تو لیس نے قواعد جیسے اہم موضوع کو بھی چھیڑا ہے مشرق کی کلاسیکی زبانوں
نے ہمیشہ نہ صرف قواعد کی پابندی کی بلکہ اس کو لازمی تصور کیا اور کسی اس
حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ جس طرح وقت کے ساتھ تمام سماجی
اور تہذیبی قدیں تبدیل سے ہلکنار ہوتی ہیں اسی طرح قواعد کے اصولوں سے
بھی تو وسیع اور تراہیم ہوتی رہتی ہیں اور چوسکتی ہیں۔ دور جدید میں لسانیات
کے بعض ماہروں نے بھی گرامر کو اسی پس منظر میں موضوع بنایا ہے بہنوری نے
اس سلسلے میں بہت صحیح نتائج اخذ کئے ہیں تاہم اس میں وہ صرف شاعری
کو شامل کرتے ہیں جبکہ اس کا اطلاق ہر ادبی صنف پر ہوتا ہے۔ قواعد کی بہت
زیادہ سخت گیری اظہار کے عمل میں رکاوٹیں کھڑی کرتی ہے نتائج و بدائع
کے بارے میں بھی ان کے غیالات لائق توجہ ہیں۔

صناع اور بدائع سے خوب کلام تر قبح نہیں لپا سکتا قابل عزت

ہیں وہ تمام مفلاً جنہوں نے علم صنائع اور بدائع کو فروغ دیا ہے لیکن اگر ان کی تمام کتابیں جلدی جائیں تو شعراء کا ذرا سا حصہ نقصان نہیں۔ صنائع اور بدائع کے استعمال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ طبیعت میں آمد نہیں ہے صنائع اور بدائع کا استعمال کلام کو عام ادبی زندگی سے جدا کر دیتا ہے اور جس زمانے میں صنائع اور بدائع کا عام رواج ہو وہ زمانہ اقوام کے انحطاط اور زوال کا ہوتا ہے غالب بہت کم صنائع و بدائع کا استعمال کرتے ہیں ان کے کلام کے اشکال کا باعث فارسیت کا قلب الغاظ کا ادق ہونا اور ترتیب کا پس و پیش ہونا ہے اس میں صنائع اور بدائع کے مشکلات کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔

حسن تو ان میں کا پایہ بند نہیں ہے بلکہ ہمہ قیود سے آزاد ہے اپنی جگہ دست ہے لیکن اس اہم فلسفیانہ نکتے کو انہوں نے تشنہ چھوڑ دیا ہے۔ حسن دراصل ایک مادی و اخلاقی تصور ہے مذکر مادی یا مابعد الطبیعیاتی اور جہاں تک مقالہ نویس کا تعلق ہے حسن کے بارے میں ان کا تصور مابعد الطبیعیاتی اور مادی ہے ان کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے کہ حسن کی آفرینش محض شاعروں کا کام ہے۔ مصوری (Imagery) کے حوالے سے غالب کا مطالعہ نہایت اہم چیز ہے اور بخیر دلی اس موضوع پر حسن قدر لکھا ہے اپنی جگہ درست ہے۔ لیکن کئی ایسے شعرا کے حوالے میں آئے ہیں جن کا مصوری سے تعلق نہیں ہے اس کی وجہ مصوری کے حقیقی مفہوم سے مصنف کی نا آشنائی ہو سکتی ہے شاید وہ کسی خیال یا منظر کی وضاحت کو بھی مصوری سمجھتے ہیں مصوری مفہوم خیال یا منظر کی وضاحت نہیں ہے بلکہ ایک ایسی تصویر کا ذہن کے سامنے آنا ہے جو اشکال و خطوط کے واضح احساس کو ابھائے۔

لے تولوں سوتے میں اکے پاؤں کا لرزہ اسی باتوں سے وہ کامریہ گماں جو ہائیگا

اس شعر میں مقصوری نہیں ہے بلکہ ایک کردار اور اس کے عمل کا واضح بیان ہے البتہ یہ شعر۔

سیاہی جیسے گر جائے دم تصویر کا قندپر
مقصوری کا نمونہ پیش کرتا ہے کیونکہ کاغذ پر سیاہی گر جانے سے ذہن ایک
تصویر کا ادراک کرتا ہے۔ اور یہ تصویر شاعر کے باطنی احساس کو بوجہ
دوسروں تک پہنچاتی ہے۔

غالب کے بارے میں اقبال کہہ لیتے نظر کا ذکر ایک اہم حوالہ ہے خصوصاً
آج کل اس کی اہمیت یوں بڑھ جاتی ہے کہ بعض اہل قلم مغض سیاسی و علاقائی
تحریک سے مغلوب ہو کر غالب کے غلات مملو آرائی میں مہمک ہیں۔

قدرت مشور حقیقت ہے۔ قدرت اور عوام کے درمیان ایک دیوار
حائل ہے جس میں سے صرف شاعر کی نظروں کے الفاظ طبع گزر پاتی ہیں اس
نظر کے کی معنویت و جذبات ہے۔ قدرت اور عوام میں ممکن ہے کوئی دیوار حائل
ہو کیونکہ عوام کی علمی سطح محدود ہوتی ہے تاہم علماء کے بارے میں اس قسم
کی شرط لگانا درست نہیں ہے جہاں تک قدرت کے تصور ہونے کی حقیقت
کا مسئلہ ہے تو دور حاضر کے جدید سائنسی انکشافات اس کے حق میں نہیں ہیں
کیونکہ میسوی صدی کے پہلی نصف کے بعد انسان نے قدرت کو پوری طرح تسخیر کیا ہے
اور حیات و کائنات کی اصل حقیقت کو پالیا ہے جس کی وجہ سے مابعد الطبیعیات
فلسفہ کے نظریہ توحید و ہر امرایت کا جادو ٹھنڈا پڑ گیا ہے ہمیں اس حقیقت
سے اتفاق ہے کہ غالب کے یہاں سادگی و ہوشیاری اور بے خودی و پرکاری
کا انتہائی کمال ہے اور ان جمالیاتی و اسلوبی اجزا میں غار ہی و داخلی شعور
و اشعار کا نہایت موندن امتزاج بھی ہے۔ ان کے یہاں شعری تشکیل کا
حرک و جہان تجزیہ و تخیل کی راہ سے گزر کر صورت و معنی تک پہنچتا ہے جس
کو خود انہوں نے قطر سے گہر تک کا سفر قرار دیا ہے لیکن بھنوری صاحب

جو نیکو وجدان کے بائے میں تصوراتی نقطہ نظر کے قائل ہیں اس لئے وہ شعری تشکیل کے اس طریقہ کار کی تحسین نہیں کر سکے۔ مجموعی طور پر ان کا مطالعہ مابعد الطبیعیاتی اور تصوری ملکیت خیال ہی کا باندھے جس کے سرے فلسفہ تصوف سے جاملتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ لکھتے ہیں۔

مولائے ماسر ان فنون لطیفہ کے کوئی بھی عالم کے مظاہرات خارجہ اور باطنی کو نہیں دیکھ سکتا اور اس وجہ سے ان کا اظہار نہیں ہو سکتا۔
 ”سہل متنع“ کے حوالے سے غالب کے بلئے میں ان کی روش پر دو رایش نہیں ہو سکتی ہیں۔ کانٹ کے تصور آزاد احسن اور بادلیر کے تصور شاموانہ حسن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

کانٹ (Kant) نے اپنی کتاب (Kritik der urtheilskraft) میں خوب کہا ہے کہ بہت سے اشعار ایسے ہوتے ہیں جن میں ”آزاد حسن“ ہوتا ہے توہ پھولوں کی طرح اپنے معنی بیان کرتے ہیں بلکہ اپنی خوشبو سے مشام جاں کو مسرور کرتے ہیں اگر ان کے نشر کرنے اور ان کے مطالب کی دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ کوشش ایسی ہوگی جس طرح کوئی شخص پھولوں کی خوشبو کو پانے کی عرض سے ان کی پتیوں کو توڑ کر میٹھ کر کے بعض اوقات انسان پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس کیفیت میں خواب کی حس ملتا چوتی ہے خواب میں متخیلہ ادراک پر غالب آ جاتی ہے اور عجیب پر لطف پریشان مطلب مظاہر پیش کرتی ہے۔

بودلیر (Baudelaire) لکھتا ہے کہ شاموانہ کیفیت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ جب تمام حواس ہنایت درجہ تاثیرات پذیر اور ذکی الحس ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں پردہ اُبلد

ایک دیکھنے لگتی ہیں، پر ضرور مقامات میں خفیف حسن خفیف آواز کو کانٹنے لگتے ہیں اور شور سے بالکل غائب ہوتے ہیں اختلاص خیالات واقع ہوتا ہے اور جملہ اشیائے عالم اپنی صورت سے بسا اوقات دوسری صورتوں میں منقلب ہو جاتی ہیں اور خیالات میں ناقابل حل اطلائی تغیر پیدا ہو جاتا ہے آواز میں رنگین معلوم ہونے لگتی ہیں اور رنگ میں نقشہ پیدا ہو جاتا ہے۔

کانٹ اور بادلیہ کے تصورات کا ماخذ مابعد الطبیات اور فلسفہ تعقوت ہے جبکہ غالب اپنے نظریہ حیات اور عمل کے اعتبار سے مادہ پسند واقع ہوئے تھے چنانچہ ان کے اسلوب کی ان خوبیوں کا مطالعہ موجودات کے حوالوں سے کرنا زیادہ معنی آفریں ہو گا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

مرزا کی دلچانگی جرمن دیوانے شاعر الفرڈ مام برٹ
(Alfred Mombert) سے کچھ کم نہیں، مام برٹ
اپنے جنون میں کہتا ہے۔

Da mond und sonne dir ewig kalt ist und
dir das sternengewöl be ewig alt ist.

Und in der finsternis zer reisst dem
gang lausche meinem geasang.

مرزا صاحب فرماتے ہیں :-

ہمیں زوال آمادہ احسنزلو آفریش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہ گزار بادیاں
دلچانگی کو کن معنوں میں استعمال کیا ہے اس کی کوئی وضاحت کے بغیر
جرمن زبان میں انہوں نے مام برٹ کے اشعار نقل کر کے ایک معنی فیصلہ صادر
کر دیا ہے اگر وہ ان اشعار کا اردو ترجمہ بھی لکھ دیتے تو شاید شعر و ادب کے

کے قارئین کسی نتیجے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے۔ حسن کا مہلتے عالم ہونا۔ مادہ و حرکت کی توضیحات اور وحدت الوجود کا ذکر معقوت نے فلسفہ تصوف کے حوالوں سے کیا ہے جس کا محرک فلسفہ تصوف کی طرف ان کا اپنا جھکاؤ ہے غالب فلسفہ تصوف کے اخراجات سے ماؤزس تھے بلکہ مسک کے اعتبار سے بعض معاملات میں وہ ”وحدت الوجود“ اور ”وحدت کل“ کے قائل بھی تھے۔ لیکن ان مسائل کو انہوں نے اپنی حقیقت پسندی اور فکری کی سائنسی جہت سے ہم آہنگ کر کے ایک اپنا نظریہ بنالیا۔

میں کلام غالب کی بنیادی خامی تاثراتی اور مابعد الطبیاتی اسلوب اختیار ہے۔ تاثراتی اور مابعد الطبیاتی انداز اس اعتبار سے کمزور ہوتا ہے کہ اظہار رائے کرنے والا اپنے شعور اور لاشعور اور آراء کو بے سرو سامان سے جھوڑ دیتا ہے اور عقلی خیزت سے استفادہ کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتا ہے۔ اس کے لئے تصدیق بے معنی چیز ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقالات میں جا بجا ایسے مقامات آئے ہیں جہاں بے لگام اخبار کا تسلسل دکھائی دیتا ہے اس طرح بعض اشعار کی جو تشریح صاحب مقال نے پیش کی ہے وہ بھی محض قیاس ہی ہو سکتی ہے میں کلام غالب کے فاضل مصنف نے اس حقیقت کو محسوس ہی نہیں کیا شعر و ادب کی معنوی جہتیں تلاش کرتے ہوئے لکھنے والے کی پوری شخصیت اس کے عملی کردار و معمولات کو بھی مطالعہ کا حصہ بنانا پڑتا ہے۔ غالب تو ان خوبصورتی میں ہیں جن کے بہاؤ افکار و معنی اور عملی زندگی کے برتاؤ میں کوئی عدم مطابقت نہیں پائی جاتی ہے۔ اردو شعر و ادب میں شاید ہی کوئی اتنی قد آور شخصیت ہو جس نے اپنے زندگی کے ہر عمل کو اس کی حقیقی صورت میں منکشف کیا ہے اس نے اپنی شاعری اور نثر کے ذریعہ اپنی ہی شخصیت کے تمام متنی و مثبت پہلوؤں کو لوگوں کے سامنے منکشف کیا ہے اس اعتبار سے وہ حوصلے کی اس منزل

ہرے جہاں ایک منحل اور پائے انسان ہی پہنچ سکتا ہے۔ مومن کلام غالب کا اعلا کرتے ہوئے جہاں معاصر نقاد سحر الفارسی نے حق نقد ادا کیا ہے۔
حالی کے بعد غالب کے دوسرے اہم نقاد ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری ہیں۔

حالی کو ملتے جلتے ادبی مذاق اور تغیر آہستہ سلاج کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا وہ جانتے تھے کہ انگلش لٹریچر کی ترقی منہل کے کمال تک پہنچ گئی ہے اور پھر لٹریچر نے اسی کی بدولت کچھ عرصے سے مگے قدم بڑھانا شروع کیا ہے۔ لیکن وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ جب تک لوگ یہ نہ سمجھیں گے کہ ہم کو انگلش لٹریچر سے کونسی باتیں اخذ کرنی چاہئیں اور اپنے قدیم مشرقی لٹریچر سے کیا سبق لینا چاہیے اس وقت تک ہمارا لٹریچر اصلی ترقی سے محروم رہے گا:

”البکہ مضمون میں مشرقی لٹریچر سے سبق لینے اور انگلش لٹریچر سے اخذ واستنباط کی صلاحیت کی شرط سب سے پہلے ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری نے پوری کی۔ وہ عربی، فارسی، ترکی کے وسیلے سے مشرقی ادب اور جرمن، فرانسیسی اور انگریزی کے ذریعے مغرب کے ادب اور افکار سے براہ راست واقف تھے اور ان کو اپنی ذات اور اپنے مزاج کا حصہ بنالینے کا اگر انہیں خوب آتا تھا ڈاکٹر بجنوری نے اپنے احساسِ جمال اور مطالعے کی وسعت کو اپنے تجربے یا نئے شعور اور دلکشی اسلوبِ نشر سے ہم آہنگ کر کے غالب کو ایک نئے زائے سے آلودہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ تذکروں کے ذریعہ جو ایک رسمِ چلی آرہی تھی کہ غالب کو سراہنا ہو تو اسے خزل میں نظیر ہی اور نقاد میں عرفی، خانقاہ کے ہم پلہ قرار دے دیے جاتے۔ بجنوری نے غم کروا دیا۔ انہوں نے پہلی بار مغربی شعرا کے ذہنی آفتاب سے غالب کی فکر اور اسلوب کا موازنہ کیا اور اس طرح ایک پائیدار افتادہ اور رسمی انداز نگارش سے ہٹ کر تجرباتی عنصر اور جمالیاتی شعور کو تنقید میں شامل کیا۔

مغرب کے بعض اعلیٰ نقادوں اور انشاء پردازوں کی طرح بجنوری نے بھی

• نسخہ حمید: کے مقدمے کا جو بعد میں "محاسن کلام غالب" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا پہلے ٹیکے، براہ راست، منظر اور امان آغاز میں آفاذ کیا ہے۔ ان کے بعد آل احمد سرور اور ڈاکٹر خورشید الاسلام نے بجنوری کے اس انداز کی قابل ذکر پیروی کی ہے۔ عمرانی علوم کے بحث میں جس طرح دوستو کے "معاہدہ عمرانی" کی پہلی سطر "انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن بدھرد یکھو وہ پایہ زنجیر ہے: اپنے ایجاد و اختصار اور جامعیت کے باعث اب تک ان گفت بار دہرایا گیا ہے اسی طرح نقد غالب کے میدان میں بجنوری کے "محاسن کلام غالب" کی اس پہلی سطر کو بار بار نقل کیا گیا اور متعدد نقادوں نے موضوع بحث بنایا ہے۔ ہندوستان کی الہامی کتابیں جو ہیں مقدس دید اور دیوان غالب۔

ہر چند کہ الہامی کتاب کا تصور خود غالب کی اس دہائی سے پیدا ہوا ہے۔ جس میں غالب نے اپنے دیوان کو دین سخن کی کتاب ایزدی قرار دیا ہے۔

گر ذوق سخن بہ دہر آئیں بوجے

دیوان مرا شہرہ پر دیں بوجے

غالب اگر این فن سخن دیں بوجے

آں دیں را ایزدی کتاب آیں بوجے

جس طرح لان جائی نس (LONGUUS) کے زیر اثر استاد پوری

صدی میں ملن کے لئے (SUBLIME) کا لفظ ایک مروجہ اصطلاح بن

گیا تھا اس طرح غالب کے کلام کے لئے "الہام" کی اصطلاح بجنوری کے بعد بہت

عام ہو گئی ہے۔

عبدالرحمن بجنوری نے ابتداء میں غالب کے کلام سے ہٹ کر خود قواعد

اور معانی و بیان کے بارے میں جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان سے معلوم ہو جاتا

ہے کہ تخلیقی عمل کو یہ لکھی اصولوں کا پابند نہیں رکھنا چاہیے اور چونکہ خود تخلیق

نشر رکھتے ہیں اس لئے اصطلاحات اور مروجہ اصولوں کی جانب ان کا رویہ قدرے

آزاد یا "رومالوی" ہے۔ انہوں نے "محاسن" میں کیا خوب لکھا ہے "فیکیر اور غالب کا کام قواعد زبان کی پابندی نہیں ہے۔ یہ قواعد کا کام ہے کہ ان کی پابندی کر ڈاکٹر مجذبی نے غالب کے ذہن کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس کی فکر اور اس کے الفاظ کے تلازمات کو نئے احساس جہاں کے ساتھ اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر مجذبی نے مغرب کے قدیم و جدید اکابر شعراء و مفکرین سے غالب کا موازنہ کیا ہے لیکن انہوں نے انگریزی طرز تنقید کو جوں کا توں اختیار نہیں کیا بکہ شروع میں ہی انہوں نے اردو کے خیالات کو مغربی طرز پر جانچنے کی مخالفت کی ہے انہوں نے دراصل اپنے مطالعے اور مغربی ادب سے اپنی آگہی کے سہارے وہی طرز اختیار کیا ہے جو حالی نے "یادگار غالب" کے دوسرے حصے میں اختیار کیا ہے یعنی مختلف اکابر شعراء سے موازنے کے ساتھ ساتھ غالب کے اشعار کی اپنے انداز میں تشریح۔ البتہ حالی کے اس عمل کو مجذبی نے بہت اگے بڑھا دیا ہے۔ عبدالرحمن مجذبی نے کلام غالب کی تشریح اور توضیح کے دوران فلسفے کے علاوہ علم طبیعیات اور علم مناظر و مرایکے اصولوں سے بھی اپنے موقف کو بڑے دل نشین سہارے میں ظاہر کیا ہے۔ اور غالباً یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ سائنسی اصطلاحات اور سائنسی اصولوں کے ذریعے تنقید کو وضع بنانے اور بعض انسانی تجربات و مشاہدات کی تفہیم کا یہ انداز پہلی بار عبدالرحمن مجذبی نے اردو تنقید میں شامل کیا ہے چنانچہ ڈاؤن کے نظریہ ارتقاء اور ڈارون کے نظریہ سائنس سے بھی انہوں نے "محاسن کلام غالب" میں بحث کی ہے۔

مجذبی کے اسلوب تحریر کا ایک خاصا یہ بھی ہے کہ وہ فلسفیانہ مباحث کے اسباب کو ایک دو سطروں میں بیان کرتے ہیں اور پھر اس سے اپنا ایک نتیجہ خود اخذ کرتے ہیں اور اس طرح غالب کی فکر اور جذبے کے باہمی رشتوں کے سربوٹ رموز ٹپے انوکھے انداز میں افشا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مجذبی نے بعض نقادوں کی طرح آغوش تنقید کا جادو چلانے کے لئے

حالی کی اہمیت کو کم کرنے کی کوششیں نہیں کی ہے۔ اردو شاعری کے شہیاد
 واستعارات کے ضمن میں جیسا انہوں نے شعراء کے لیکر کے فقیرتے پہنے کی روش
 پر اظہار خیال کیا ہے تو اپنے موقف کی حمایت میں خود حالی کا قول پیش کیا ہے۔
 انہوں نے محفل کراہیں امر کا اعتراف کیا ہے کہ حالی نے مرزا غالب کے کلام کی
 نئی دنیا کا پتہ لگایا ہے اور حقیقت میں مولانا حالی مرزا غالب سے کچھ کم مستحق
 داد نہیں ہیں :

ڈاکٹر بجنوری کی ان تمام تر خوبیوں کے باوجود یہ بات چند سنجیدہ اذہان کو
 اچھی نہیں لگی کہ انہوں نے بعض اوقات اکابر سے غالب کے موازنے کی رو
 میں کئی جگہ صریح نام گھنوا دیئے ہیں اور صحیح معنوں میں موازنے کا کوئی
 انداز پیدا نہیں کیا ہے۔ لہجہ کہیں کہیں زور بیان اور تخیل کی رو میں اتنے آگے
 نکل جاتے ہیں کہ تحریر میں تنقید سے زیادہ افسانے اور داستان کا رنگ پیدا
 ہو جاتا ہے اور لوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ توازن برقرار نہیں ہے جو مصنف نے
 اپنے مخصوص منطق انداز کے ذریعے قائم کیا تھا۔ شاید اسی لئے بعض نقادوں کو
 بجنوری کی تنقید کسی حد تک جذباتی معلوم ہوتی ہے۔

اس مجموعی صورت حال کے باوجود، مہمان کلام غالب کے حصے میں یہ کہنا
 کہ وہ غالب کی طرف داری کا نمونہ ہے صحیح نہ ہوگا۔ البتہ کہا جاسکتا ہے کہ
 اس کے بہت سے نکات متنازع ہونے کے باوجود جدید سائنسی تنقید
 کی کسوٹی پر پڑے اترتے ہیں اس طرح غالب کا یہ دعویٰ کہ ہے
 غالب اگر ایسی فن فن دیں ہو کہ آں دیں را ایزدی کتاب این بود
 اور بجنوری صاحب کا فقرہ ہے
 ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں مقدس دیدار اردو دیوان غالب
 سہالہ کے باوجود بے سنی نہیں ہیں۔

غالب شکن

اردو کی جدید منزل کا ایک اہم نام مرزا یاسر یگانہ چنگیزی ہے۔ ان کا شمار بیسویں صدی کے پہلے دور کی فہرست میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ انہوں نے کلاسیکی لہجے اور روایت کے مردہ جسم میں سائنسی فکر کی تازہ روح پھونک کر کلاسیکیت کو جدید عصر کے رنگ و آہنگ سے سجایا ہے۔

یہاں توڑنے والے زمین سے ہونگے اسی زمین میں دیا سوائے یہی کیا کیا اس اقبال سے وہ جدید منزل کا اہم نام ہیں لیکن ہماری شاعری کی تاریخ نے جو ذاتی بغض و عناد یا پسند و ناپسند سے کبھی چھٹکارا حاصل نہ کر سکی ان کو باوجود نظر انداز کیا ہے۔ تعلیم برصغیر کے بعد یہاں کے نقادوں نے سوائے پروفیسر مجتبیٰ حسین ان کو موضوع نہیں بنایا۔ کچھ اہل نظر ان سے اس لئے ناامنی ہے کہ وہ اقبال کے مخالف تھے۔ ان مجموعی حقائق کے ساتھ جب ہم جدید منزل گوئی کے حوالے سے ان کی طرف نظر ڈالتے ہیں تو وہ جدید منزل کے بانیان میں اقبال سے زیادہ بلند مقام پر دکھائی دیتے ہیں۔ یگانہ ایک حوصلہ مند اور مضبوط شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی خودی بلند تھی اور خودداری آثار پرستی کی انتہائی حد کو جھوٹی تھی بڑا بڑا اور شخصیت کے اقبال سے وہ غالب ثانی تھے بلکہ شعری اسلوب اور فکر کے کوچے میں بھی ان کا رنگ غالب ہی سے مطابقت رکھتا تھا نظریے سے استواری کے معاملے میں بھی وہ بہت کثرت تھے ان میں نہ لہک تھی اور نہ منہ گویا جو جانے والی کیفیت یہی وجہ ہے کہ انہوں نے

ہر بتلا کا مقابلہ کیا اور وہی کچھ کہا جو وہ کہنا چاہتے تھے تحلیل نفسی کی ٹیکنگ کو۔ اگر ان کی شخصیت کے مطالعے میں دھما بتایا جائے تو بہت سے حقائق تک سائی حاصل ہو سکتی ہے۔ ان کی ذہانت کے اندر غالب کا شعور اور آہنگ موجزن تھا لیکن جیب اس کا اظہار ادبی سطح پر ہوا تو ان کی اتنا اور آہنگی میں ارتعاش پیدا ہوا اور انہوں نے شعوری طور پر اس حقیقت کو ذمہ داری اپنے لئے ایک چیلنج سمجھا بلکہ اتنا کا مسئلہ بنالیا۔ اس ہنگ سے ان کی غالب شکنی کی ابتدا ہوتی ہے اور وہ "یگانہ غالب شکن" کی حیثیت سے منظر عام پر آتے ہیں۔

یگانہ نقاد نہیں تھے نہ انہیں جدید تنقیدی اصولوں سے زیادہ آگہی تھی تاہم جب ہم "غالب شکن" جیسے مقالے کا موازنہ دور جدید کے معروف نقادوں نئے غالب شکن انہیں ناگی سے کرتے ہیں تو "غالب شکن" زیادہ معتبر محسوس ہوتا ہے۔ یگانہ نے بہر حال غالب کی شعری و فکری جہت کے بعض اجزاء کا انکشاف کیا ہے غالب سے ان کی جنگ شخصی تھی اور اس جنگ میں اگرچہ انہوں نے ہتھیار تو نہیں ڈالے لیکن براہی کی بنیاد پر مصالحت ضرور کر لی۔

آؤ غالب سے دو کئی کر لیں وہ بھی استاد ہم بھی اک اُستاد
 • غالب شکن کوئی تنقیدی مقالہ نہیں ہے بلکہ سید مسعود حسن صاحب فریدی کے نام لکھا گیا مکتوب ہے چنانچہ اس میں مخاطب کا انداز اور ذہن میں موجود حقیقی احساسات کا برملا اظہار ہوا ہے مکتوب نگاری کے لمحے میں لکھنے والے کی نفسیات ذرا مختلف ہوتی ہے اور چونکہ اس کا مخاطب بھی ایک ہی ہوتا ہے اور مخاطب سے تعلق خاطر کا پہلو غالب آجاتا ہے اس لئے فکری منعوت بندی کا امکان ختم ہو جاتا ہے فرد کے حقیقی محسوسات و نظریات تک سائی حاصل کرنے کے لئے خطوط اہم حوالہ بن سکتے ہیں لیکن ہمارے اہل فکر نے اس

مانخذ کی طرف وہ توجہ ہی نہیں دی جس کے وہ متقاضی تھے۔ حال ہی میں حمایت علی شاعر نے اس حقیقت کو محسوس کیا اور اپنے احساسات و خیالات کے ترسیل پر صورت و مراسلہ کی ہے جو کہ ایک اچھا تجربہ ہے۔

یگانہ نے چند باعیاں کہی تھیں جن میں غالب کی ذات کو طنز کا نشانہ بنایا گیا تھا یہ استدعا انہوں نے اپنے احباب کو روانہ کئے تھے ان کے خط سے پتہ چلتا ہے کہ سوائے مسعود حسن کھوسہ کسی نے ان کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ انہوں نے یگانہ مشورہ دیا کہ یہ اشعار شائع نہ کریں جو کہ وجہ اختلاف ہوا اور یگانہ کی تحریر غالب شکن کا محرک بھی بنا انہوں نے ایک اصول کی حیثیت سے بہت صحیح بات لکھی ہے۔

میرا مذہب غالب پرستی نہیں ہے بلکہ خود پرستی یا حتی پرستی۔

خود پرستی کیلئے یا حتی پرستی کیلئے

آہ کس دن کے لئے ناحق پرستی کیجئے (یگانہ)

دوسری ضرورت ان نظریات باعیوں کی یہ ہے کہ غالب پرستوں کی دلوانہ وار عقیدت اور پہلی جونی ذہنیت پر کچھ چوٹ تو پڑے ذرا اپنے حواسوں میں تو آئیں۔

اُدو کے ادبی مورخوں اور مبصرین کی یہ کمزوری رہی ہے کہ وہ پرستی واڈ پسندی کے درمیان امتیاز نہیں کر سکے اور اکثر داد و تحمیں کا وہ انداز اختیار کر لیا جو فرد پسندی کے بہانے فرد پرستی پر تمام ہوا۔ اس غلطی کا سب سے پہلے ارتکاب کرنے والوں میں محمد حسین آزاد کا نام آتا ہے جنہوں نے ذوق جیسے عام شاعر کو زمین سے اُٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا اس کے بعد عبدالرحمن بجنوری نے بھی کچھ غالب کے لئے کر دکھایا اور اب یہ سلوک اقبال کے ساتھ جو رہا ہے۔ یگانہ نے ذرا سخت لہجے میں اس رجحان کی گرفت کی ہے جو کہ معنی و مقاصد کے اعتبار سے بجا نہیں ہے کیونکہ اس سلوک سے فرد کی شخصیت

اور اس کی اہمیت و حرمت میں اختلاف کے بجائے اس خطاط و اجتہاد کا عمل واقع ہو جاتا ہے کسی کو کسی پر مسلط کر دینے کی کوشش ہمیشہ ایک منفی رد عمل کا سبب بنتی ہے۔ اردو کے بڑے شاعروں میں میر وغالب اور فیض کی پذیرائی عام کی وجہ یہی ہے کہ لوگوں نے اپنے انتخاب کے ذریعہ ان شاعروں کو اپنے خاندان میں شامل کیا۔ یہ گمانہ کہتے ہیں کہ غالب کیلئے زیادہ سے زیادہ ہندوستان کا ایک بلند خیال و دقت پسند شاعر اور یہ کہ کراچیوں نے شاعر کو اپنے شعور و لاشعور میں خود ہی اُتار لیا ہے یہ ایک ہی جملہ اعتراضات کی سہ بن جاتا ہے البتہ اس جملے کے ساتھ ہی ان کی آواز اور قوت و مد عمل جاگ پڑتے ہیں چنانچہ دوسرے جملے میں وہ کہتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ آخر کی چند رباعیاں (وہی جن میں غالب پر تمسخر کیا گیا ہے) شائع نہ کی جاتیں تو اچھا تھا انہیں شائع کر کے گویا میں نے اپنے ہی خواہوں کا (یہی خواہ بقول آپ کے) دل دکھایا ہے۔ خیر یوں ہی ہیں۔ غلط بینی یا غلط فہمی کے سبب کوئی آپ جرم کا کھا جائے تو اور بات ہے ورنہ مجھے دل دکھانے کی ضرورت کیا تھی البتہ یہ آزمنا ہے کہ ہنر کو ہنر کی حیثیت سے جانچنے اور قدر کرنے کی صلاحیت ملک میں کتنی ہے۔

جو بسا اوقات اپنے خیالات کی بھول بھلیاں میں گم ہو جایا کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ پہلے سرے کا بے مراعہی ہے ہلنا چڑھنا جوڑ کے ساتھ گونگا بھی ہے مضمون چرلنے کو جرات ہے مگر ہضم نہیں کر سکتا تصرف کی قدرت نہیں رکھتا جوڑی کھل جاتی ہے زبان ایسی گونگی کہ نفس مطلب کو شاعرانہ زبان میں ادا نہیں کر سکتا۔ شونش شوائس کے تک بند ہی کر لیتا ہے۔

غالب پر مضمون چرانے کا الزام لگانا کہ جذبہ مخالفت پرانے مخالفت کی نشاندہی

کہتا ہے۔ غالب غازی کے ان شاعروں میں ہیں جو شعری تاریخ میں بیز معولے مرتبہ رکھتے ہیں۔ مکتے میں ہرات کے سیرنے سے ان کی غازی گوئی کا برملا اعتراف کیا تھا۔ ایک اہل زبان کا یہ اعتراف ایک ہندوستانی کے دعوے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ غالب صدی ۱۹ء کے موقع پر ایران کی وزارت فرنگ و ہنر نے شہنشاہ ایران کی ایما پر ان کی غازی کلیات شائع کی تھیں کسی خیال یا موضوع کا دہرایا جانا ذہن کا ایک لاشعور میں اور فطری عمل بھی ہو سکتا ہے ایک ہر خیال یا موضوع کسی ایک عید یا فرد کا پابند نہیں ہو سکتا ہے مختلف زبانوں میں بھی انسانی تجربات اور وارداتیں ایک جیسی ہو سکتی ہیں فرق صرف اسلوب اور انداز کا ہوتا ہے۔ فیض کے یہاں ایسے شعر ملتے ہیں جن میں میر و غالب کے موضوعات دہرائے گئے ہیں کیونکہ یہ موضوعات فیض کے عہد میں بھی اتنے ہی اہم اور تروتازہ تھے جتنے کہ اشعار ہیں اور انیسویں صدی میں تھے لیکن فیض کا شعر غالب کے اسلوب کا مقابلہ کر سکا ہے

ہم پر دہش لوح و قلم کرتے ہیں گے۔ جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہے۔ فیض کہتے رہے جنوں کی حکایات خونِ بگل۔ ہر چند ہم تنہا کسی میں ہمارے قلم بچے۔ لپ
یگانہ میں غالب کی طرح ناقد ہی سخن اور عدمِ اعتراف کے کرب میں مبتلا رہے۔ ان کے لاشعور میں یہ تنہا موجود تھی کہ زمانہ ان کو جانے اور پہچانے ان کی یہ خواہش بجا اور جائز تھی انہوں نے اپنے شعروں میں جو نقطہ نظر اور موضوعات پیش کئے تھے ان کی معنوی اور عمری اہمیت مسلم ہے ہر شاعر تخلیق کار اور اہل نظر اپنے افکار و نظریات کو دوسروں تک منتقل کرنا چاہتا ہے یہ بالکل فطری اور صحیح جذبہ ہے تہذیبی و تاریخی اعتبار سے بلند اور پختہ معاشرے پر بھی یہ فرض مانا جاتا ہے وہ اپنے نئے افکار و نظریات سے استفادہ کرے لیکن مؤخر اپنی تاریخی و تہذیبی سر بلندی کے باوجود اس عمل میں بہت نا اہل ثابت ہوا، کیونکہ یہاں علم کا ہمیشہ فقدان رہا اور بیسویں صدی کی ابتدائی چند دہائیوں میں

بھی تعلیم عامہ کی فی حد شرح معمولی ہیں رہی۔ اردو شعروادب کی ایک بدقسمتی یہیں ہے کہ اس نے عوام کی زبان ان کے پیچھے اور معیائے سہل کر اپنے لئے زبانِ دبیاں اور فن کے جو پیمانے مقرر کئے ہیں انکے مافذ یا تو عربی و فارسی ہے یا امرائے و شرفاء کی محدود دنیا یعنی اردوئے معلیٰ کی دنیا چنانچہ عام زندگی اور تہذیب سے اس کے رابطے کبھی مضبوط ہو ہی نہ سکے۔ یہ گناہ اس مصری حقیقت سے لاتے ہیں بے خبر تھے جتنے کہ ہمارے کلاسیکی اساتذہ انہوں نے لکھا ہے کہ۔

اچھے دشمن و دوست کی پردہ ہوتی تو ایسا کیوں کرتا، مگر ملک
خود اپنی قوت فیصلہ کو محروم کئے لیتا ہے یہ کون سی عقل بندی ہے
میں غالب کی طرح داؤد سخن کا بھوکا نہیں ہوں کہ لوگوں کو شکار کر
چمکار کر اپنے ڈھپ پر لاؤں یا یہ کہوں کہ!

نہ ہسی گر مرے اشعار میں معنی نہ ہسی۔

اس طنزیہ فقرے کے پس پشت کبھی وہ احتجاج موجود ہے جو یگانہ اپنی
ناقدری پر کر رہے ہیں تحویل نفس بھی اس کی نشاندہی کرے گی۔ غالب کے سلسلے
میں اس مصرعے کے جو معنی انہوں نے اخذ کئے ہیں صحیح نہیں ہیں کیونکہ غالب
اپنے عہد کا وہ انسان تھا جس کو اس دور کی بہت زیادہ گری ہوئی فکری سطح
کا اچھی طرح علم تھا وہ یہ بھی جانتا تھا کہ آنے والے دور میں علم و ادراک کی
سطح پیدا ہوگی جو اس کے افکار و نظریات کو سمجھنے کی اہل ہوگی۔ فارسی اور اردو
دو لٹریچر زبانوں ہیں اس نے مستقبل کی اس صورتحال کا ذکر کیا ہے۔

کو کیم را در عدم ارج قبولی بودہ آ
شہرت شرح بہ گیتی بعد من خواہد شدن
ہوں نغمہ نشاطِ قصو سے نغمہ سنج
میں مندریب، گلشنِ ناآسردیہ ہوں

جس معاشرے میں ذوق اور ظفر جیسے اساتذہ ہوں وہاں غالب جیسے
بدلت پسند و روایت شکن فلسفی کے افکار و نظریات کی پذیرائی کا کیا امکان
ہو سکتا تھا اور اس قسم کے معاشرے میں اس سے بہتر ادا کیا جواب ہو سکتا تھا

گر نہیں ہیں میرے اشعار میں معنی نہ کہیں

ناقد ہی زمانہ کے خلاف دیکھنا کار و عمل اتنا شدید ہے کہ وہ شکایت میں بہت زیادہ ذاتی اور متبذل سطح پر آگئے ہیں اور ان کا ہجو علی وادب سے حدود سے بجا و ذکر گیا ہے یہاں بھی وہ اپنے حریف غالب کے مقابلے میں کمزور دکھائی دیتے ہیں جو درگزر کے معاملے میں فراخ دل واقع ہوا تھا۔

کمال تو وہ شے ہے کہ مار کھونٹوں کے داد و وصول کر لیتا ہے پھر ضمیر فروشی کرنے یا تالیف قلوب کی منافقانہ پالیسی برتنے کی کیا ضرورت ہے۔ داد تو مجھے ایسی ملی کہ زمین و آسمان گواہ ہیں۔ ساوا کھٹو عاجز آکر میرے بائیکاٹ کرنے پر مجبور ہو گیا سامنے آنا منہ دکھانا چھوڑ دیا ذرا غور تو کیجئے اس سے بڑھ کر اور کیا داد ہوگی؟ بائیکاٹ کا فلسفہ یہی تو ہے کہ روندنا ہوا دشمن جب سرطرح عاجز آجاتا ہے کوئی کاٹ نہیں کر سکتا تو بائیکاٹ کے حربہ پر آخر آتا ہے خدا جانتا وہ میرے کون سے قدر وادوں ہیں جو نفس کمال کو غالب پرستی کے ساتھ مشروط سمجھتے ہیں۔ یہ اچھی مشروط ہے کہ میں غالب کی شان میں ایسی دباہیں نہ کہتا اُن کے عیب کو ہنر سمجھتا یا کم از کم اس کے عیب کو چھپائے رکھتا تو میرا کمال کھپا آتا اور نہیں تو نہیں۔

دعویٰ و شفیق مرزا انہیم بیگ چغتائی اسی بات پر ایک دن اپنے عم محترم جناب مرزا ابراہیم بیگ صاحب قبلہ سے لڑ پڑے کہ غالب کیا ہیں مرزا یہ کہتا تو حضرت حماد و حضرت ابو بکر کو بھی نہیں ملتے تو اس سے کیا نفس کمال پر کوئی زوال آ سکتا ہے اگر یہی بات ہے تو کیا آپ اپنے خلیفہ عزیزوں سے رشتہ قطع کر لیں گے؟ اس پر جناب قبلہ میرے ہاں دعوے مرزا انہیم بیگ صاحب چغتائی کے والد محترم ایسے خوش ہوئے کہ فاکسدار کی مدد میں ہرجستہ چند اشعار لکھ ڈالے

جس کی ابتداء اس شان سے فرماتے ہیں۔ جھڑ
 "فرید وقت ہیں یہ میرزا یگانہ بھی۔"

"اس نام کلام غالب کے منظر ہیں غالب ہی کا غلبہ ہے جبکہ مصنف پر فے
 کے پیچھے مصروف تماشا ہے۔ غالب شکن میں یگانہ مرد میدان ہیں اور غالب
 پس پردہ ہیں۔ غالب شکن کا مصنف اپنے آپ کو پہچانا چاہتے ہیں اور
 وہ بھی زیر دست۔"

باوجود ان عیوب کے جو مجھ میں ہیں ملک میں ایک ایسا
 بے تعصب تعلیم یافتہ طبقہ بھی موجود ہے جو مجھے دوست رکھتا
 ہے ہنر کو ہنر کی حیثیت سے دیکھتا ہے غالب پرستی کے ساتھ
 مشروط نہیں سمجھتا خدا جانے یہ مشروط قدردانی کیا بلا ہے ؟
 آل انڈیا شاعر کانفرنس کا بیور میں اگر کسی شخص نے میرے اس
 مصرع کو (وہ کون یگانہ ؟ وہی غالب کے چچا) نقل کر کے حاضرین
 جلسہ کو بھڑکایا تو اس کی شکایت کیا۔ اس کی نگاہ بدین کا
 تقاضا یہی ہونا چاہیے تھا۔ وہ "تراشہ" کے تمام صفحات میں
 آخر کی انہیں پانچ سات مزاحیہ رباعیوں کو کتاب کا ماحصل سمجھتا
 ہے کتاب کا اصل موضوع اس کے نزدیک یہی چند رباعیاں ہیں
 یا کم از کم لوگوں کو ایسا باور کرانا چاہتا ہے تو اس سے میرا آپ کا
 کیا بگڑا ہاں ادبی دنیا کو اس نے دھوکا دیا۔

ان تمام حربوں کے باوجود ان کے لاشعور میں موجود غالب ایک بار سچے
 شعور میں آجاتا ہے اور وہ بڑے سلیقے سے اس کی سر بلندی کا اعتراف کرتا ہے۔
 کیا غالب کے لئے یہ شرف کافی نہیں ہے کہ آخر عمر میں (میر تقی
 میر کی) تقاضا کی بدولت وہ اک کامیاب شاعر تھا۔

غالب کے طرفدار نقادوں کی جس کوتاہی کی طرف صاحب غالب شکن نے

شعر کی بے ہودہ اسلوبی اعتبار سے زیادہ ندرت نہیں ہے اور اعتبار کے نفاذ میں
عتیدت مندوں کے لئے وجہ تو جب ہے جو اپنے بڑے شاعر کی شخصیت و کردار کو
مسح کر دینے کے لئے دیوانہ وار سرگرم عمل ہیں۔ ان نادان لوگوں نے اس شدید
رد عمل کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں جو وقت کے ساتھ مستحکم تر ہوتا جا رہا ہے۔

کیا غالب کی صحیح و جائز تعریفوں سے یادوں کا پیٹ نہیں بھرتا
کہ اسے ناممکن معراج یا - اچھا لالہ بننے میں یہ مہیا نغمہ کیا جاتا ہے۔ رفتہ

رفتہ اس کا یہی انجام ہونا ہے کہ غالب ہائز زندگی میں عزت کا
مستحق ہے وہ بھی اس سے چھن جائے اس کی شاعرانہ ہضاعت اور
اس کے کیریکر کی سختی سے ہاپنچ شروع ہو جائے اور آخر کو ہوا بند
کا یہ ملمسہ تلو عنکبوت کی طرح لوٹ جائے۔ غالب پرستوں کے دیوانہ
وار عمل کا رد عمل شروع ہو چکا ہے کچھ دنوں میں ثابت ہو گا
ہے گا کہ غالب کو اور وہ زبان کا وہ منہ مند و منہ ہزاروں کے کام کو
مراہم ایامی ————— شعرانہ فارسی لٹریچر سے

۱۔ چونکہ وہ واحد فہم ہے جو نہ وہ فارسی کے سوا دیکھتی زبان
جانتے ہی نہیں تھے اب نمبر کی کا نتیجہ ہے جو شخص عتیدت کے
قریب کار محبت اور کچھ بھی نہیں۔

یہاں یہ حال غالب دشمن - بیکر نہیں ہیں وہ غالب جنم، غالب شناس اور
غالب پسند ہیں اس لئے ان کی تحریر کو "غالب شکن" کا عنوان دینا ہی غلط ہے۔

کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی شاعری کی نسبت لوگوں سے
بہتر بیادیں لکھنے اور ہر لغویہ بننے کی پوس میں تعلیم یافتہ لکھنا
کی طرح بہات غالب کو بھی آسانی صحیفہ مان لوں اور اس طرح غالب
پرستوں کی نگاہ میں بھونکی اور ذلیل عزت حاصل کروں، کیا ایسی
عزت کو جو ایک قسم کی سہیک یا رشوت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی

صبر و شہادت کے کون سے کون سے غور کر سکتے ہیں۔ ٹھیک کر مارتا ہوں
جس کی طرف کو جو وہ سب کے لئے صبر سے حاصل ہو۔ عرف عام میں
جیسے عرب کہتے ہیں۔

میں؟ مصیبت نہیں کہ۔۔۔ اب نئے صبح مرتبے سے گھٹ جائیں
گئے۔۔۔۔۔ نہ تو عہد پر جو سمجھتے تھے خواہ مخواہ یا روئے پہنا دیا
ہے وہ کڑے گات۔۔۔۔۔ عہد نے غالب کے ناقص اشعار پر (جو کاٹ
کر سبک دے گا) میں (فصول ما شیہ آرائیوں سے جس بد
کوئی جگہ دیا ہے اور تعلیم یافتہ گمراہوں نے اردو کی دنیا میں قحط الرجال
کی شرم محسوس کر کے خواہ مخواہ غالب کے سوا لگ بنا کر یونان و جرمنی کے
فلاسفوں سے بھڑا دینے کا جو منصوبہ انگیز خیوہ اختیار کیا ہے اس
کی ٹھیک کھلنے ہی کو ہے میں نے گزشتہ بیس سال کے دوران میں
مختلف مضامین کے ذریعے سے غالب کی شاعری کے مجموعہ پر پہلو پر روشنی
ڈالنے کے سوا ان کے کیر کیر سے زیادہ بحث نہیں کر جس پر خوراک
کے مستوجب اور قصائد وغیرہ سے روشنی پڑتی ہے۔

غالب سے تقرب اور غالب ثانی ہونے کی تمنہ ہی یہ گمانہ سے اس قسم
کی عبارت سمجھواتی ہے۔

آیات و جدائی اور تزلزل عالم شہود میں آپ کا ہے غالب کے آسمانی
صیغہ کا بحر کھلتا جاتا ہے چچا جہاں کو اب سمجھنے کے پیچھے پیچھے
پہنچا ہے گا بابر چلنے کا موقع نہیں۔

قافح ہر زبان تو غالب کی بد زبانی اور بد کلامی کی روشن مثال ہے
اس کا کیا کہنا؟ غالب کی دیکھا دیکھی مجھے سبھی کھری کھری مسافینے
کی عادت پڑ گئی۔ اس معاملہ خاص میں مجھ پر غالب ہی کا پرتو پڑا
ہے۔ لوگوں کو میری اس عادت سے نفرت ہے اور جونی چاہیے تو

غالب سے اور زیادہ نفرت ہونی چاہیے کہ وہ اس فن تبلیغ لڑائی کے
امام ہیں۔

قاطع برہان کی تنقید اور اس حوالے سے بددبانی کا یہ الزام محض الزام ہے۔
قاطع برہان پر غالب کی تنقید علم لسانیات کا ایک اہم باب ہے یہ صحیح اور سائنسی
تنقید تھی جس میں انہوں نے لفظ کے لغوی اور مرادی معنوں کو موضوع بنایا تھا۔
"غالب شکن" میں معتقد نے غالب کے معروف مبارح عبدالرحمن بجنوری پر سخت
تنقید کی ہے اور اس تنقید میں معقولیت کا پہلو بھی موجود ہے

یورپ کی ذہنی روشنی میں غالب کو دیکھنا غلط اصول ہے بھلا
یورپ کی دنیا سے غالب کبہ ذہن کو کیا تعلق۔ غالب کی نشوونما
ہندوستان میں اور ایرانی لٹریچر کی دنیا میں ہوئی۔ فارسی لٹریچر کی
روشنی میں غالب کے کلام پر صحیح تنقید ہو سکتی ہے۔ یورپ کے فلاسفوں
سے سب سے زیادہ ناممکن ایک طفلانہ بوا بھی ہے۔ غالب پر عاصیہ آرائی کرنے
والے فارسی لٹریچر کو تو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ فارسی لٹریچر کو
سامنے رکھ کر تنقید کرتے تو کہیں دیوان غالب کو آسمانی حسینہ یا سراسر
الہامی یا اور بچل نہ کہتے۔ غالب زیادہ سے زیادہ ہندوستان کا ایک
بلند خیال وقت پسند نگراں شاعر ہے جو آخر عمر میں راہ پر آگامی
مسح کا بھولا شام کو آئے تو گئے بھولا نہیں کہتے۔ صوفی اور وطن پرست
کا خلعت پہنانا تو نہایت مضحکہ خیز عقیدت مندی ہے۔

اصولی اعتبار سے یہ بات آج اتنی صحیح ہے جس قدر کہ یگانہ کے دور میں
حق پر ہمارے بعض معرکوں و اہم نقاد جو انگریزی زبان و ادب سے ماؤس ہیں۔
غیر ضروری حد تک اردو شعر و ادب پر اس کو مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور

صاف محسوس ہوتا ہے جیسے کہ وہ اپنی انگریزی دانی کی اطلاع اپنے قارئین کو
 دیتے ہیں اور پھر جب قارئین عبدالودود صاحب جیسے ہوں۔ ٹی ایل ایس او
 نیوز ویک وٹائزر میں شائع ہونے والے معلوماتی مضمونوں سے معلومات کو جمع
 کر کے تسلسل کے ساتھ اردو میں لکھنا کوئی ایسا کارنامہ نہیں ہے جس کی اس
 طرح داد و تحسین کی جائے۔ غالب ٹیکن: غالب پرستوں کے لئے لکھا گیا ہے نہ
 کہ غالب کے لئے۔

غالب کے کمزور پہلوؤں پر روشنی ڈالنا پڑی۔ ورنہ مجھ سے
 اور غالب مغفور سے مخالفت و مخالفت کا کوئی موقع ہی نہیں
 ہے۔ وہ انیسویں صدی کے پاس میں بیسویں صدی کا۔ میں کہتا
 ہوں اور کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ تعلیم یافتہ گمراہوں کی برہنہ
 غالب کے کمال اور شعری کی صحیح قدر شناسی کا جو ہر فطرت نے
 مجھ میں زیادہ ودیعت کیا ہے شاعر کو بہ حیثیت شاعر، شاعر ہی
 بہتر سمجھ سکتا ہے۔ مگر ضرورتِ خاص غالب کے متعلق اس
 قدر تلخ حقیقتوں کا انکشاف اس لئے جائز سمجھتا ہوں کہ غالب
 پرست ذرا حقیقت تلخ کا مزہ بھی چکھ لیں کیا میں اتنا بھی نہیں
 جانتا کہ جو لوگ گلے گونے ہو چکے ان کی غلطی کمزوریوں کو بھگانا
 سخت کم ظرفی و خباثت کی دلیل ہے۔ کیا مجھ میں وہ کمزوریاں
 نہیں ہیں جو انسان میں ہوتی ہیں۔ مگر میں کیا کروں میں اسے ادنیٰ
 خدمت سمجھ کر مندرجہ سمجھتا ہوں۔ دیکھنا یہ ہے کہ میری یہ
 تلخ لوانی کسی خاص مادہ جذبہ کے تحت ہے یا اس میں کوئی
 اصلاحی اسپرٹ پوشیدہ ہے۔ آپ غالباً اتنا ضرور سمجھتے ہوں گے
 کہ میری ان تمام تقریروں کا مخاطب غالب نہیں ہو سکتا کیونکہ
 گفتگو مردوں سے نہیں ہوتی زندوں سے ہوتی ہے اس کے علاوہ

اس حقیقت پر نظر رکھنی چاہیئے کہ مرزا غالب نے خود اپنے (المولف
برہان قاطع) پر نہایت سخت لب و لہجہ میں تنقید کی ہے مجھ سے
زیادہ غالب پر سخت کلامی یا بد اخلاقی کا الزام کھپ سکتا ہے۔
دوسری وجہ میرے اس بے کا نہ لب و لہجہ کی یہ بھی ہے کہ غالب پر
نے غالب کی مدح میں حد سے زیادہ غلو سے کام لیا ہے۔ تمام
اساتذہ اُردو کا حق تلف کر کے غالب کو فائدہ دیا ہے۔ مگر میں نے
غالب کا حق تلف نہیں کیا۔ ہاں کھری کھری سنا دی جس کے
مخاطب غالب نہیں ہیں بلکہ غالب پرست۔

غیر چند بے باعیوں پر اس قصہ کو ختم کرتا ہوں۔ یا رزندہ صحبت باقی ہے

۵

غالب کے دیوان

تحقیق کا منصب یہ نہیں ہے کہ ہم دریافتوں اور ان دریافتوں کی معاونت کرنے والے دیلوں کو مجتمع کر لیں بلکہ تحقیق کا حقیقی مقصد تمام دریافتوں کو یکجا کر کے نہیں تضادات سے پاک کرنا ہے۔ تضادات کو ختم کر کے یکسانیت (Homogeneity) پیدا کرنا اور نتائج کو ممکنہ حد تک متعین کر دینا تحقیق کا اہم ترین مقصد ہے۔ اردو زبان کے آغاز و انقلاء سے متعلق منطقی دلائل اور مباحث کے بعد متعدد فیصلے کئے گئے ہیں، مجموعی اعتبار سے ان سارے فیصلوں میں واضح اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس قدر طویل مباحث کے باوجود ہماری ادب کا محقق یا طالب علم قطعیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتا ہے کہ اردو زبان کے آغاز و ارتقاء کا مرکز — — — کہاں ہے۔ اردو زبان کے آغاز و ارتقاء کے بعد سب سے زیادہ تحقیقی مطالعہ مرزا غالب کا ہوا ہے۔ لیکن یہ مطالعہ بھی تضادات کا جنگل دکھائی دیتا ہے۔ دوا دین غالب کے مستند نسخوں کی فہرست میں گیارہ نسخوں کا ذکر ہے۔ اولین نسخہ بھوپال بمطابق ۱۸۱۶ء، نسخہ بھوپال جدید ۱۸۲۶ء، نسخہ شیرانی ۱۸۳۵ء، نسخہ گل رعنا ۱۸۲۹ء، نسخہ رام پور قدیم ۱۸۳۳ء، نسخہ بدایوں ۱۸۳۶ء، نسخہ پٹنہ ۱۸۴۵ء، نسخہ لاہور ۱۸۵۶ء، نسخہ رام پور جدید ۱۸۵۵ء، نسخہ انتخاب غالب ۱۸۶۶ء اور نسخہ ظاہر لاہور ۱۹۳۶ء۔ ان تمام نسخوں اور بعض بیاضوں کو سامنے رکھ کر مولانا عرشی نے دیوان غالب کا ایک جامع ایڈیشن موسوم بہ نسخہ عرشی ۱۹۵۱ء میں دکن ترقی اردو ہند نے شائع کیا ہے مولانا عرشی نے اپنے دیوان کی ترتیب

کے تحت غالباً غالب کے اولین دیوان نسخہ جمہوریاں بھنط غالب سے استفادہ نہیں کیا ہے جبکہ یہی دیوان غالب کا اولین دیوان ہے اور چونکہ بھنط غالب تحریر ہے اس لئے نہایت اہم بھی ہے ڈاکٹر ابو الجہد سحر کی تحقیق کاوش کے بعد اس اہم نسخہ کا پس منظر سامنے آیا ہے اس نسخہ کا سن کتابت ۱۸۱۶ء اور ۱۸۲۳ء ہے ابو النضر خالہ کی تعلیم کے اعتبار سے ۱۸۳۳ء بالکل صحیح ہے کیونکہ انیس سال کی مدت میں ہجری اور عیسوی سنیں میں دو سالوں کا فرق ممکن ہے البتہ انیس سال کے عرصے میں دو سنیں کا مساوی رہنا ممکن نہیں ہے مولانا عرش نے سن کتابت کا تعین ۱۸۳۳ء کیا ہے اور انیس سال کے عرصے میں دونوں سنیں کو مساوی رکھ کر حساب کیا ہے چنانچہ ۱۸۳۱ء مشکوک ہے لہٰذا ۱۸۳۱ء میں مرزا نے اپنا ایک دیوان ردیف کی ترتیب سے صاف کر دیا تھا۔ اس نسخہ میں ۱۸۲۱ء سے قبل کے اشعار شامل نہیں تھے۔ ان میں وہ اشعار بھی تھے جو اولین دیوان میں قلمبند ہوئے تھے لہٰذا مولانا عرش نے اپنے نسخہ میں — منسوخ کلام نقل کیا ہے وہ اولین دیوان سے نہیں بلکہ منقحہ عیار اشعار اور قدیم باختات سے نقل کیا ہے نسخہ جمہوریاں بھنط غالب اس حصہ کے کلام کا مجموعہ ہے جب مرزا اسد تخلص کرتے تھے اور طرز بیدل میں رہتے کہتے تھے اس دیوان میں کثر اشعار بیدل کی پیروی میں ہیں لیکن بعض اشعار سادہ و بامعنی ہیں۔ اس تضاد سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا اس زمانے ہی میں طرز بیدل سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کوشش کا نتیجہ وہ انتخاب ہے جو ۱۸۲۱ء میں مرتب ہوا۔

لہٰذا غالب کا سن پیدائش ۱۷۹۹ء اور ۱۸۱۲ء ہے۔ اولین دیوان انیس سال کی عمر میں لکھا گیا ہے مولانا عرش نے عیسوی اور ہجری سنیں میں انیس جمع کر کے ۱۸۱۶ء اور ۱۸۳۱ء کا تعین کیا ہے۔
لہٰذا نسخہ جمہوریاں بھنط غالب۔

ذکر کی چشم حصول نفع صہبت ہائے مسک سے : رنگ بیدل
 ایریشیم ساز موندے جہن ہے مجھے : رنگ بیدل
 دیکھا نہیں ہے ہم نے بہ عشق بتاں اسد : حیرت شکستہ مالی حشر کشی کی ساؤ
 عمر بھر ہوش نہ بیکجا ہوئے میرے کراسد : میں پرستندہ لئے صنم چند ہاں باہن
 قدیم نسخوں کی مدد سے جو مستند داوین طبع ہوئے ہیں ان میں نسخہ برلن بھی
 ہے۔ غالب پر ہونے والی تحقیق میں نسخہ برلن کا کوئی ذکر نہیں آتا ہے۔ سمرقنداری
 نے انکار غالب جبر ۱۹۶۹ء میں اشعار تابرین ایڈیشن مرتبہ ڈاکٹر فاکر حسین کا نام کیا
 ہے۔ نادم سینا پوری نے باہن تعریف گہ کے متن میں سرسری طور پر نسخہ برلن کا ذکر
 کیا ہے برلن ایڈیشن کا جو نسخہ میری نظر سے گذرا ہے اس میں کسی مرتب کا نام
 نہیں ہے۔ جہیں سائر کا یہ ایڈیشن خوبصورت مصوری شاپ میں برلن سے ۱۹۲۶ء میں
 طبع ہوا تھا۔ اردو کے ایسے تمام حروف جن کے ساتھ "ط" کی حرکت شامل ہے چار
 لفظوں سے بدل گئے ہیں مثلاً ٹ کی جگہ ت اور ڈ کی جگہ ڈ۔ اس ایڈیشن میں مرزا کے
 ہاتھ کا لکھا ہوا فارسی دیباچہ شامل ہے جس کے آخر میں سنہ ۱۲۴۵ھ لکھا ہے۔
 نیا ادارہ لاہور نے اپنے ایڈیشن میں اسی دیباچے کو نقل کیا ہے نسخہ برلن میں جس تصویر
 کو شامل کیا گیا ہے جرمنی کی ساخت ہے اور قیاس پر مبنی ہے لیکن یہی تصویر بعد میں
 مقبول ہوئی۔ حالانکہ غالب کی حقیقی تصویر وہ ہے جو رخت فوٹو گرافر نے مرزا کی وفات
 سے کچھ پہلے تیار کی تھی۔ دیباچے کے حساب کو اگر بنیاد بنایا جائے تو نسخہ برلن نسخہ دیبا
 کی نقل معلوم ہوتا ہے۔ غالب کے جس دیباچے کو نسخہ برلن میں شامل کیا گیا ہے غالباً
 نسخہ رام پور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نسخے کو مرزا نے ۱۸۴۳ء میں صاف کر لیا تھا۔
 ترتیب کے اعتبار سے نسخہ رام پور کو تقدم حاصل ہے لیکن نسخہ برلن کی ترتیب

۴ " غالب کے کلام میں اطلاق عناصر "

۵ جامعہ ملیہ کالج لیرکراچ کی برکوی انٹرویو کی جگہ ہے۔

۶ یہ عزائم نقلہ معلیٰ کے مشاعروں میں سنائی گئی تھیں۔

نومام پور سے بہت مختلف ہے چنانچہ نسخہ برلن رام پور کی نقل نہیں ہو سکتا۔ نسخہ بدایوں کا اصل منظوم یا اس کی نقل ہائے سطحی نہیں ہے دوسری جانب نسخہ برلن میں ایک غزل "باز سچا اطفال ہے دنیا میرے آگے" اور دوسری غزل "سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں" بالترتیب اگست ۱۸۵۲ء اور مئی ۱۸۵۲ء کے عرصے سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ نسخہ برلن کو نسخہ بدایوں کی نقل بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ دلائل و اخذات کی عدم موجودگی کا مسئلہ ابھی جگہ اہم ہے لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے نسخہ برلن کسی نہ کسی منسوب دیوان کی نقل ضرور ہے برلن ایڈیشن میں ایسی غزلیں بھی ملتی ہیں جو مروجہ دوا دین میں نہیں ہیں۔ اور ایسے اشعار بھی ہیں جو مروجہ دوا دین سے مختلف ہیں غالب کی ایک غزل جو ردیف نکمہ میں ہے ارج سہ ۱۸۶۲ء میں ابن الین کی فرمائش پر خط میں قلمبند ہوئی ہے لیکن یہ غزل ان تمام نسخوں میں بھی ملتی ہے جو ۱۸۶۸ء سے قبل لکھے گئے تھے اس مسئلے پر بھی تضاد ملتا ہے مثلاً نسخہ طاہر کے مرتب صفحہ ۲۳ پر لکھتے ہیں کہ محولہ بالا غزل مالک رام کے یہاں نقل نہیں ہوئی ہے جبکہ نام سینا پوری صفحہ ۲۵۱ کے مطابق مالک رام نے صفحہ ۲۸۷ تا صفحہ ۲۸۸ پر یہ غزل نقل کی ہے۔ الفاظ کی نشست و برخاست کے اعتبار سے بھی مختلف دوا دین میں اختلاف پایا جاتا ہے جس کی مثال ذیل ہے۔

یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ وجد ذوق میں	برلن ایڈیشن
یاد ہیں وہ دن تجھے غالب کہ وجد ذوق میں	نسخہ طاہر
یاد ہیں اے ہم نشیں وہ دن کہ وجد ذوق میں	نسخہ حمید
اے تیرا غمزہ یک قلم انگریز	نسخہ طاہر اور نسخہ حمید
اے تیرا جلوہ یک قلم انگریز	نسخہ برلن
خدا کے واسطے پردہ نہ کہہ سکا اٹھایا رب	نسخہ برلن
خدا کے واسطے پردہ نہ کہہ سکا اٹھایا رب	مروجہ دوا دین

۷۷ مولانا عرش کے مطابق الحاق شعر ہے۔

غلام رسول ہنر رکھتے ہیں کہ شعر: ذرا کہ زور سینے سے کہ تیر پرستم نکلا۔ کسی مستند نسخے میں نہیں ملتا لیکن شعر برہنہ میں یہ شعر موجود ہے البتہ: سینے سے کہ بجائے سینے پر نکلا گیا ہے۔ ذرا کہ زور سینے پر کہ تیر پرستم نکلا ہے۔

زیر نظر مائتے سے غالب کے دو ادب اور الفاظ کی نشست و برخاست کے معانی میں تضادات کا پتہ چلتا ہے اور خود محققین غالب کے متعین کردہ نتائج میں اختلافات سے خالی نہیں ہیں۔ غالبیات کا موضوع ایک مستند، مکمل اور جامع تصنیف کا ہنوز انتظار کر رہا ہے ایک ایسے مکمل دیوان کی بھی ضرورت ہے جس میں مرزا کا صحیح کلام، منسوخ کلام اور الحاقی کلام یکجا کر دیا گیا ہو۔ الفاظ و ترکیب کی نشست و برخاست میں فرق کے مسئلے کا بھی کوئی مستقل اور متفقہ طور پر قابل قبول راستہ متعین نہیں ہو سکا ہے۔ مولانا عروسی نے ممکنہ حد تک مکمل اور جامع دیوان مرتب کرنے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن اس نسخے میں نسخہ بھوبال بجز غالب کے کلام کا کچھ حصہ نقل نہیں ہوا ہے جس کی بنیاد پر نسخہ عروسی بھی نامکمل رہ جاتا ہے۔

۶ دستنبو

مسلم برصغیر کا ہر زمانہ تاریخ سازی اور تاریخ نویسی کا زمانہ رہا ہے لیکن جدید علمی اور تاریخی نقطہ نظر کے آئینے میں دیکھیے تو یہ تاریخ نویسی علم کے ساتھ مذاق دکھائی دیتی ہے کیونکہ عموماً فاضل و قائلع نگار اور تاریخ نویس محرک الزما دیباہوں اور امراء و شرفاء کے قصیدے رقم کرتے تھے ان کے کارناموں ان کے فتوحات اور ان کی ذاتی زندگی کے شاندار معمولات کی تفصیلات جمع کر کے محرک الزما اور شرفاء کی مثالی تصویریں بناتے تھے تہذیبی علمی اور ادبی و شعری دنیا کی معلومات کا ماخذ بھی محرک الزما، امراء اور شرفاء کی محدود دنیا ہی تھی۔ عوام کی بہت بڑی اکثریت کو ملک کی سیاست اور اقتصادیات میں کوئی مرتبہ حاصل نہیں تھا اور زبانوں کی شاعری اور تہذیبی زندگی کو لغویت کا درجہ دے کر علم و فکر کی قلمرو سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔

استعماروی و رانیسویں صدی میں برصغیر آنے والے بعض انگریزوں اور انگریز تاریخ نویسوں نے مقامی مورخوں کی نااہلی کا ذکر کیا ہے۔ ان لکھنے والوں نے سماجی و اقتصادی حوالوں سے ایسے بہت سے حقائق منکشف کئے ہیں جن میں برصغیر کے محرک الزما، امراء اور شرفاء کے اصل چہرے ان کے عجیب و غریب کارنامے اور سیاسی غلطیاں ساخنہ آئی ہیں عموماً ہمارے مسلم مورخین نے ان تاریخی حقائق سے اور سچائیوں کا ویاقتدار سے شجرہ کرنے کے بجائے ان کو انگریزوں کی سیاسی و اقتصادی تعصب پر محمول کیا ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ بعض انگریز

مبھروں اور تاریخ لکھنے والوں نے انگریزوں کے سیاسی و اقتصادی مفادات کی بناء پر غلط بیانی سے کام لیا ہے تاہم ہر انگریز مؤرخ کے لئے اس قسم کا تقصیر صبیح نہیں ہوگا۔ مقامی تاریخ نویسوں کا ذکر کرتے ہوئے ایس ٹی سولیل لکھتا ہے:

Most of the native annalists wrote as court flatterers, or chroniclers of the achievement of some ruling house. They are not interested in the lives of the poor, the mean, and down-trodden. They did not speculate on or describe the economic structure of the feudal society in which they lived. This defect is true of all histories written before modern scientific research became a serious subject of study dependent of the co-relation of all aspects of a people's culture and their state of civilisation,

The study of social history is in fact a very modern development, which was possible only when the attention of serious minded writers were deflected from the narrow field of the classical writers of antiquity, and when the importance of economic factors in the development of mankind's mission was at least realised.

سولیل کے اس بیان میں تعصب یا بے معنویت کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ غالب کا زمانہ سیاسی و اقتصادی، علمی و فکری اور تہذیبی و معاشرتی انقلاب کے آغاز کا زمانہ تھا۔ اُن کے وقت تک برصغیر کے کسی مؤرخ نے تاریخ کی کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی تھی جو جدید تاریخی نقطہ نظر کی نشاندہی کرتی ہو لیکن انہوں نے تاریخ پر جب قلم اٹھایا تو شاعری کی طرح اس میں بھی اجتہاد سے کام لیا۔ انہوں نے خطوط میں جو واقعات لکھے ہیں ان کے پس پشت سماجی

دیہاسی اور اقتصادی و تہذیبی منظر صاف دکھائی دیتا ہے۔ دہلی کی عام زندگی کے مظاہر پہلی بار اپنی اصل صورت میں حوالہ دیتے ہیں تاریخ کے بارے میں ان کا ایک متعین نقطہ نظر تھا اور یہ نقطہ نظر یقیناً برصغیر میں موجود انگریزوں کے اثرات ہی کا نتیجہ تھا چنانچہ سر ہید کے مسوئے پر انہوں نے کڑی تنقید کی اور آئین اکبری کو بے وقت کی رائی قرار دے کر مسترد کر دیا۔ اس حقیقت سے ان کا یہ نہیں کہ وہ کوئی باقاعدہ مورخ نہیں تھے تاہم بہادر شاہ ظفر کی نظر ان ہی پر پڑی اور ان کو خاندان تیمور کی تاریخ لکھنے کا فرض سونپا گیا ایران کی بے حد مبہم اور پیچیدہ تاریخ پر بھی انہیں عبور تھا۔ ڈاکٹر شوکت مہراری نے اس موضوع پر اپنی کتاب غالب فکر و فن میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

برصغیر میں انگریزوں کی سیاسی و اقتصادی گرفت کے بارے میں غالب اپنا ایک منفرد نقطہ نظر رکھتے تھے اور ۱۸۵۷ء کے بعد حالی، سرسید، ڈپٹی نذیر احمد مثلی اور آزاد سب ہی نے اسی نظریے سے استفادہ کیا کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہ تھا جس ذمے میں غالب نے زندگی کے میدان میں قدم رکھا ان دنوں برصغیر کا مسلم اقتدار اپنے وجود کی قوت کے سائے امکانات ضائع کر کے مغلوب ہوجا تھا اور برصغیر کی اقتصادی و سیاسی قوت کا توازن انگریزوں کے ہاتھوں میں تھا انگریزی تہذیب و سیاست اور انتظامی ڈھانچہ مسلم اقتدار کے اس روایتی ڈھانچے سے بدرجہا بہتر اور نر و تازہ تھا جس میں اب آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی۔ مقامی نظم و نسق پر انگریز حاوی تھے ان حالات میں اس جہد کا کوئی باشعور اور صاحب بصیرت انگریزوں کے مقابلے میں مسلم اقتدار کی ہموائی کیوں کر کر سکتا ہے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے ایک اتفاقی گڑبڑ کے نتیجے میں پھوٹ پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ پھیل گئی اس کے پس پشت کوئی عوامی تحریک یا تنظیم نہیں تھی کوئی مربوط منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی اور رابطوں کے ذریعے اس کے لئے ذہنی

طرح پر لوگوں کی کوئی تربیت نہیں ہوتی تھی۔ غالب زمانہ شناس اور آگاہ شخص
تھیں ان کو اچھی طرح علم تھا کہ انگریزی سیاست اور منظم و برتر فوجی قوت کا مقابلہ
مفل فوجیں کر سکی نہیں سکتی تھیں اس حقیقت سے کبھی وہ بے خبر نہیں تھے کہ
برصغیر کے لوگوں کے مجموعی اقتصادی مفادات کی تشکیل کا ذریعہ بہادر شاہ ظفر
نہیں بلکہ انگریز تھے ان کے ذائقہ مفادات بھی انگریزوں ہی سے وابستہ تھے۔
یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ملن و فکری سیاسی و اقتصادی اور تہذیبی و سائنسی تہذیب
میں زیادہ برتر ہونے کی بنا پر انگریزوں ہی کو خوش آمدید کہا! ان کی تاریخی دستاویز
”دستبنو“ میں یہ نقطہ نظر نمایاں ہے۔

”دستبنو“ میں معنوں میں تاریخ کا جامع مقالہ ہے جو نئے تاریخی شعور کے
نشاندہ ہی کرتا ہے معلوم نہیں کن وجوہات کی بنا پر اہل تاریخ نے اس مقالے کو
درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ ۱۸۵۷ء کے مجموعی حالات کی نہ جانے کتنی صورتیں ہیں جو
اس تاریخی مقالے میں پہلی بار ظاہر ہوئی ہیں ۱۸۵۷ء کا موضوع پر انگریزی میں
کئی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اردو میں یہ اپنے موضوع پر یقیناً اولین کتاب ہے
”ڈاکٹر ملک حسن اختر نے اس مقالے کے ان اجزاء کو منتخب کر دیا جو غالب کی کردار کشی
میں مددگار تھیں لیکن اس کے معن کی ان جزئیات کو نظر انداز کر دیا جو تاریخ میں
حوالے کا درجہ رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر حسن اختر نے لکھا کہ ان کو انیسویں صدی کے سیاسی
و سماجی اور اقتصادی و تہذیبی تناظر میں دیکھنے کے بجائے سن ۱۸۵۷ء کے بعد والے
دور کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ”دستبنو“ کا اصل مقالہ فارسی زبان میں
لکھا گیا تھا اس کا اردو ترجمہ پہلی بار افکار کے غالب نمبر ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا
تھا لیکن نہ تو اس کے بعد یہ کتابی صورت میں منظر عام پر آیا نہ اس پر مباحثہ تک
کوئی میر حاصل ہوئی ہے اور نہ ہی مؤرخین نے اس کو لائق توجہ گردانا ہے
چنانچہ دستبنو کے اردو ترجمے کو اس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔

ضمیمہ

۷

دستبنو کا اردو ترجمہ

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء

اس سال جس کا مادہ تاریخی بہ رعایت تفرجہ رستخیز ہے جا رہا ہے اور اگر صاف صاف پوچھو تو ۶ لہ رمضان ۱۲۶۳ھ کو پیر کے دن دوپہر کے وقت مطابق ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء اپنانک دہلی کے قلعے اور قلعہ کی دیواریں لڑا سنبھیں جس کا آخر چاروں طرف پھیل گیا۔ میں رلزلے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ اس دن جو بہت منحوس تھا، میرٹھ کی فوج کے کچھ بد نصیب اور شوریدہ سرسپاہی شہر میں آئے نہایت ظالم و مفسد اور دمک حرامی کے سبب سے انگریزوں کے خون کے پیاسے شہر کے مختلف دروازوں کے محافظ جو ان فسادیلوں میں ساداش ہو گئی ہو، شہر کی حفاظت کی ذمہ داری اور حق ملک ہر چیز کو سبھول گئے۔ ان بن بلٹے یا مدعو کردہ مہاتوں کو خوش آمدید کہا۔ ان مدحوش سواروں اور ڈاکٹر پیادوں نے جب دیکھا کہ شہر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، اور محافظ ہمان نواز ہیں، دیوانوں کی طرح ادھر ادھر دوڑ پڑے۔ بدھر کسی انسر کو پایا اور جہاں ان قابل احترام (انگریز) کے مکانات دیکھے جب تک ان انصروں کو مار نہیں ڈالا اور ان مکانات کو بالکل تباہ نہیں کر دیا۔ ادھر سے رخ نہیں بچا۔ کچھ مسکین گوشہ نشین جن کو انگریزی حکومت کی مہربانی سے کچھ نان دمک میسر تھا شہر کے مختلف ملاقوں میں ایک دوسرے سے دور زندگی کے دن گزار رہے تھے، ایسے مسکین و صلح پسند، جو تیر دتیر کے فرق سے ناواقف تھے اور

اندھیری راتوں میں چوروں کے شور و غل سے ڈر جاتے تھے۔ جن کے ہاتھ تیرا در تلواری سے خالی تھے۔ سچے سچے بچہ تو ایسے لوگ ہر گلی کو چمکے، گھر کے ہر حصے میں ہیں یہ وہ لوگ نہیں جو لڑائی کے ارادے سے مکر کس کر تیار ہو سکیں۔ اس کے باوجود (کہ ایسے صلح پسند و خیر خواہ شہر کے ہر حصے اور ہر گلی کو چمکے میں تھے) اس وجہ سے کہ تیز پہنے والے پانی کو خس و خاشاک سے نہیں روکا جاسکتا۔ اپنے آپ کو مجبور سمجھ کر ہر شخص جنگیں و ماتم زدہ اپنے گھر میں بیٹھ رہا۔

مجھوری و خانہ نشینی

انہیں غزدہ لوگوں میں سے ایک میں بھی ہوں، میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ شور و غوغا سنا۔ پتا تھا کہ کچھ معلوم کروں کہ اتنے میں شور مچ گیا کہ امروں قلعہ صاحب اجنٹ بہادر اور قلعہ دار قتل کر دیئے گئے ہر طرف سے پیادوں اور سواروں کے دوڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ زمین ہر طرف گلی انداموں (انگریزوں) کے خون سے رنگیں ہو گئی۔ باغ کا ہر گوشہ ویرانی اور بربادی کے سبب سے بہادریوں کا مدفن بن گیا۔

انگریزوں کے قتل پر انڈیا افسوس

افسوس وہ پیکر علم و حکمت، انصاف سکھانے والے، خوش اخلاق و نیک نام مالک ! اور صد افسوس وہ پری چہرہ نازک بدن قانونیں جن کے چہرے چاند کی طرح چمکتے تھے اور جن کے بدن کبھی چاندنی کی طرح دمکتے تھے ! حیف و نیچے جنہوں نے ابھی دنیا کو اچھی طرح دکھا ہی نہیں تھا، جن کے ہنس مکھ چہرے گلاب و لالہ کے پھولوں کو شرم ملتے تھے اور جن کی خوش رفتاری کے سامنے ہرن اور کبک کی رفتار بد نما معلوم ہوتی تھی یہ سب ایک دم قتل و خون کے سمندر میں پھنس کر دھیر فنا میں ڈوب گئے۔

افناک، ہنگامیاں برسانے والی وہ موت، شعلے جس کا سرواڑہ ہیں جس کے
 ہاتھوں لوگ غمزہ لہتے ہیں اور مائیں لباس پہننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر ان
 مقتولین کے سرانے آہ و زاری کرے اور اس غم میں سیاہ پوش ہو جائے تو ردا
 ہے۔ اگر آسمان (اس غم میں) خبار کی طرح منتشر ہو جائے اور زمین گریباؤ کی طرح
 اپنی جگہ چھوڑ دے تو بہا ہے۔

ای تو بہار چون تین بھل بخون بغلت
 ای روزگار چون شب بمل تار شو
 ای آفتاب ہوئے بسیلی کعبہ و کن
 ای ماہتاب داغ دل روزگار تو

لے موسم بہار! بھل کی طرح خاک و خون میں مل جا۔ لے زلزلے!
 اندھیری رات کی طرح تاریک ہو جا۔ لے آفتاب! (اس غم میں)
 اپنے رخساروں کو پیٹ کر، نیلا کر لے اور لے پاند (حکیم) ہر لے
 کے دل کا داغ بن جا۔

خدا خدا کر کے وہ منوس دن ختم ہوا۔ ہر طرف گہرا اندھیرا پھیل گیا۔ ان
 سیاہ باطنوں اور بے جسم قاتلوں نے شہر میں جا بجا پڑاؤ ڈالا۔ اندرونِ قلعہ
 شاہی باغ کو گھومتوں کا اصرار بنا یا اور نشیمن سلطانی کو خواب گاہ رفتہ
 رفتہ دور دور کے شہروں سے خبریں آئیں کہ مختلف فوجوں کے باغیوں نے ہمسر
 چھاؤنی میں امیروں کو قتل کر دیا ہے (اور ملک حراموں نے حکم کھلا بغاوت
 کا شور مچا رکھا ہے) گردہ کے گردہ خواہ سپاہی ہوں یا زمیندار سب یک دلی
 ہو گئے اور کسی طے شدہ پروگرام کے بغیر دور و نزدیک ہر جگہ ایک ہی کام کے لئے
 مکر بستہ ہو گئے اور ہر کسی مضبوطی سے مکر میں کسی خفیہ کے صرف اس دریائے خون
 کی موجیں ہی ان کو کھول سکتی تھیں جو کھروں سے گزر چلے۔ (مختلف مقامات کے
 لوگ کسی قرار داد کے بغیر جس طرح ایک ہی کام یعنی قتل و خون میں لگ گئے تھے

اس سے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس طرح جھاڑی بہت سی سینکوں کو ایک ہی بندے باندھا جاتا ہے اسی طرح گنتی تھامے باہران لڑنے والوں کے کمرے بھی ایک ہی کمرہ سے بندھے ہوئے ہیں۔

باغیوں کی مذمت

جسے شک ہندوستان کو آرام و آسائش سے اس حد تک خالی کرنے کے لئے کہ اگر ان چیزوں کو ڈھونڈا جلنے کو ایک گھاس کے تھکے کے برابر بھی نشان نہ ملے۔ ایسی ہی جھاڑی کی ضرورت تھی۔ بہت سے لشکر سرداروں کے بغیر تیار ہوئے بہت سی فوجیں انہروں کے بغیر لڑائی کے لئے اسٹھ کھڑی ہوئیں۔ توپیں، گولہ بارود، پھترے غرض سارا سامان انگریزوں سے حاصل کیا، لڑائی کے سامنے طریقے انگریزوں سے سیکھے اور انہیں سکھانے والوں اور مالکوں سے لڑنے کے لئے تیار ہوئے۔ دل لوہے یا پتھر کا ٹکڑا نہیں ہے۔ کیسے نہ سمجھ آئے۔ آنکھیں رخنہ دلدار نہیں ہیں کہ آئینہ نہ بھائیں۔ حکمرانوں کی موت کا عزمننا نا چاہئے اور ہندوستان کے ویرانی پر رونا چاہئے۔ شہر مالکوں سے خالی اور بندہ ہائے بے خداوند سے بھرا ہوا جیسے باغ، باغبان سے خالی اور درختان بے ثمر سے پُر ہو۔

لیٹیرے ہر قسم کی پابندیوں سے اور سوداگر بمصوبہ ادا کرنے کی ذمہ داریوں سے آزاد، گھروں پر اپنے معلوم جوتے ہیں اور مکالت (لوٹ مار کرنے والوں کے لئے) خوان مفت کا حکم رکھتے ہیں۔ جو لوگ گناہی کے گوشوں سے چھپے ہوئے تھے وہ گروہ درگروہ خیر بخت اپنی آرائش اور بے شرمی کا مظاہرہ کرتے پھرتے ہیں امن پسندی اور نیک ہنڈ لوگ گھر سے بازار تک آتے ہوئے راستے میں بیسوں جگہ عاجزی اور مغلوبیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیٹیرے دن میں دلیری کے ساتھ لوٹ مار میں مصروف ہیں اور رات میں ریشمی لبتروں پر مہو خواب۔

شرنا کی تباہی

بڑے بڑے اعلیٰ فائنان لوگوں کے گھروں میں چراغ جلانے کے لئے تیل نہیں۔ اندھیری رات میں جب پیاس کی شدت بڑھتی ہے، بھلی چکنے کے منتظر ہوتے ہیں کہ یہ دیکھیں کہ کوزہ کہاں رکھا ہوا ہے اور پیمانہ کدھر ہے۔

دنانے کی اس بے نیازی و بے امتیازی کو کیا کہوں کہ وہ کم زور لوگ جو سارا دن مٹی پیچنے کے لئے زمین کھودتے تھے۔ ان کو مٹی میں سونے کے ٹکڑے مل گئے اور جن لوگوں کی مغل میں رات میں آتش گل سے چراغ روشن ہوتے تھے اندھیرے گھروں میں ناکامی و ناامیدی کے غم میں مبتلا ہیں۔

کوٹوالی مشہر کی زن و دختر کے ملاوہ ساری نازنینان شہر کا زیور بزدلی اور یہ کاروباروں کے قبضے میں ہے۔ (زیور و آرائش سے معرا ہونے کے بعد) ان نازنینوں میں جو ایک سا انداز ناز باقی رہا تھا۔ اس کو ان ذودلت گذارادوں نے چھین لیا کہ ان کی خود نمائی کے کام آئے جو محبت کرنے والے پہلے نازنینانے گل اندام کی ناز برداری کرتے تھے۔ اب ان بد خصلتوں کے ناز اٹھانے پر مجبور ہیں۔

انہی سرد پا لوگوں کے دماغوں میں حذور اس حد تک سا گیا ہے کہ اگر ان کے خود نمائی کے کام تو معلوم ہو گا کہ کچھ بگڑے چکر کھلتے پھر رہے ہیں اور پچھوٹے ہر وقت اس طرح خود ناز خود نمائی میں محو رہتے ہیں گویا بانی کی سطح پر کچھ نیچے سے چلے جاتے ہیں بڑے بڑے عالموں اور ناموروں کی آبرومندی میں ملادی گئی اور جن لوگوں کے پاس نہ دولت تھی نہ عزت۔ وہ بے اندازہ زرو جواہر اور عزت و آبرو کے مالک ہیں۔ جس کا باپ گلیوں کی خاک چھانتا پھرنا تھا۔ وہ ہوا کو اپنا خادم سمجھ رہا ہے۔ جس کی ماں بڑوسی کے گھر سے آگ مانگ کر لاتی تھی وہ آگ پر حکم چلانے کا مدعی ہے کہیں آگ اور ہوا پر حکومت کرنا چاہتے ہیں اور ہم ان پریشان حال لوگوں میں سے ہیں جو صرف سکون و آسائش کے چند لمحوں اور

انصاف کے خواہشمند ہیں۔

درد و دم کے پیش تو انسانہ نبش نیست
چشم ستارہ را مژدہ خوں چکاں دہد
میر درد سہرا حال مہتائے نزدیک ایک قصہ ہے اور بس
لیکن اس کو سن کر ستاروں کی آنکھوں سے اشکِ خوں جاری
ہو جائیں گے۔

ڈاک کا نظام درہم برہم ہو گیا، جس کے سبب سے بہت سے کام ڈک گئے
ہر کاروں نے آنا جانا بند کر دیا۔ ڈاک میں پیام بجنہ پہنچانے کی گنجائش نہیں ہوتی
ہاں خطوط کی آمد و رفت کا قاعدہ ہے۔ مگر اس محکمے کی ایک اور شاخ (ٹیلی گراف)
ہے کہ نہ مضارب کی جنبش، بلکہ جنبش مضارب سے، جو اس سے پیدا ہوتی ہے۔
ہزاروں پیام (خبری) اندر سے باہر نکلتے ہیں۔

قدر کی مذمت

(جو لوگ) مذہب اور قانون کے بے حد پابند ہیں، انصاف کو نظر انداز نہ
کریں اور بتائیں کہ اس سامنے انتظام کا درہم برہم ہو جانا، خدا کی بخشش ہوئی دولت
کاٹٹ جانا، ڈاک کا نظام درہم برہم ہو جانا،

۱۔ غالب کے مطبوعہ نسخے میں اس کے آگے کا حقہ کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے پڑھنے
کے قابل نہیں ہے۔

قیدیوں کی رہائی

میں نے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ یہ بات بیان کرنے کے لائق تھی کہ یہ فہرست طلب جنگ جو جس مقام سے چلے وہاں کے قید خانے کا دروازہ کھول دیا اور قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ وہ پرانے زمانے قیدی جنہوں نے نئی نئی آزادی پائی تھی شاہی دربار میں آئے۔ سجدہ کیا اور کسی علاقے کی صوبیداری یا شاہی آقاؤں سے بھاگے ہوئے حیر و فادار غلاموں نے آستان شاہی کا بوسہ دیا اور کسی سرخند علاقے کی حکومت کے طلب گار ہوئے۔ کوئی نہیں کہتا ہے اور یہ بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہر خواہش مند کو حاضر ہونے کی اجازت اور ہر پناہ مانگنے والے کو پناہ کیوں دے دی جاتی ہے؟ بس یہ زمانے کی بوجھیں ہیں۔

تعباد فوج

اب دہلی کے انڈیا اور باہر تقریباً ۵ ہزار سواروں اور پیادوں کی فوج پڑی ہوئی ہے صاحبانِ علم و دانش انگریزی حکام کے قبضے میں اس وسیع شہر کا کوئی علاقہ نہیں ہے صرف شہر کے جانب مغرب۔ ایک پہاڑی پران کا قبضہ ہے یہ پہاڑی شہر سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ (انگریزوں نے) نہایت ہنرمندی سے اس جنگ پر موجودہ تمام کر کے ایک مضبوط قلعہ سا بنا لیا ہے اور اس کے چاروں طرف کوئی اثر و طاقت، رعد و خروش تو نہیں لگا رہا ہے اور استقلال کی مدد سے اس عالم پریشانی میں اطمینان (کی دولت) حاصل کر رہا ہے۔

انگریزوں کی مورچہ بندی

شہر کی فوج نے جو میگزین اسی شہر سے حاصل کیا تھا، اس میں سے چند توپیں شہر کی فوج پر جمادی ہیں، اور اس طرح اپنے آپ کو جنگجو سرداروں کا حربہ قریض کر لیا ہے توپوں اور بندو قوں کے دھویں سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے اور اس سے اگلے برس لہے ہیں۔ رات دن دونوں طرف سے گولہ باری ہوتی ہے جیسے اوپر سے پتھر برس لہے ہوں۔ مٹی جون کی گرمیاں ہیں۔ دھوپ کی تیزی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے آفتاب برج ٹورہ جو زائیں بے طرح آرتس فروری میں مشغول ہے معلوم ہوتا ہے خود بھی اسی آگ میں بجھنا چاہا ہے۔ جو لوگ سرد ہوا دار مکانوں میں آرام و آسائش کے ساتھ بٹھتے تھے دن بھر دھوپ میں جلتے ہیں اور راتیں انہیں جلتے ہوئے پتھروں پر بیچ دتاب کے عالم میں بسر کرتے ہیں۔ اسفندیار اس میدان جنگ میں ہوتا تو روئیں تہی کے باد صفا اس کی ہمت و جواں مروی ہوا ہو جاتی۔ اگر رستم اس داستان کو سن لیتا تو جی چھوڑ دیتا (شہر کی فوج کے) مختلف مقامات سے آئے ہوئے سپاہی دن چڑھے شیر دل انگریزوں سے لڑنے کے لئے جاتے ہیں اور سورج ڈوبنے سے پہلے ہی واپس آ جاتے ہیں بیرون شہر کی داستان شب دروز تو یہ تھی۔ اندرون شہر دیکھا ہوا تھا اس سلسلے میں، ایک دن کا قہقہہ سننے کے لائق ہے۔

درگ ساد من لوائی ہست

کہ بمر خولہ انگر اندازو !

زمین لوائی خورشید نشان ترسم

کاتش اندر لوائی اگر اندازو

سرگوستی است ہر زبان کو زبان
 بر من از خویشش نخب را اندازد
 میرے ساز دل کے تاروں میں وہ نغمے پنہاں ہیں
 جن سے چنگاریاں برستی ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ
 مفتی ان کی زد میں نہ آ جائے۔ میری زبان پر
 وہ داستان ہے جس سے میرے دل پر غم
 چلنے لگتے ہیں۔

ایک شخص جس کے دماغ میں فرماں روائی و تکبر کے خیالات سمجھے ہوئے
 تھے۔ درپردہ اپنے آقا اور مربی کا دشمن بن گیا۔ اس خیال سے کہ اگر یہ
 واقعہ کار اور راز داں زندہ ہے گا تو میں نے جو خزانہ (نا جائز طریقوں سے)
 جمع کیا ہے اس کا راز کھل جانے کا ہمیشہ نقصان پہنچانے کی تدبیریں سوچتا
 تھا اور یہ بات مشہور کر کے کہ حکیم حسن اللہ خاں، انگریزوں کے خیر خواہ اور
 طرفدار ہیں، فوج کے امیروں کو ان کی طرف سے سہارا دیتا ہے۔

حکیم حسن اللہ خان

ایک دن کچھ لوگ حکیم احسن اللہ خاں کو قتل کرنے کے لئے ان کے محل
 پر چڑھ دوڑے۔ حکیم صاحب اس وقت قلعے میں بادشاہ کے پاس تھے۔ چند
 آشفتمند سر قلعے میں گئے اور حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ بادشاہ نے انہمائے محبت
 و بندہ پروری سے حکیم صاحب کو پہلنے کے لئے، اپنے آپ کو ان پر گرا دیا۔ اس
 طرح حکیم صاحب نیچے جاں تو بچ گئی لیکن یہ فتنہ اس وقت تک ختم نہیں ہوا
 جب تک کہ ان کا سارا گھر تباہ نہیں ہو گیا اور حکیم صاحب کا گھر جو خوبصورتی
 و آرائش میں، نگار خانہ چین کی طرح منظم تھا، اب ان کی چھت کو آگ
 لگا دی گئی۔ چھت کے شہتیر اور منقش تختے جل کر راکھ ہو گئے۔ دیواریں سیاہ

پڑائگیں۔ گویا وہ محل اس علم میں سیاہ پوش ہو گیا تھا سے
 فریب مہر زگر دوں مخور کا میں بے مہر
 وہ ہنسا کہس را کہ در کنار کشد
 آسمان کی مہربانی سے دھوکا نہ کھانا۔ یہ ہے وہ فاجی شخص
 کو آئینہ محبت میں جوگر دیتا ہے، اس کو کیمش و عذاب
 میں مبتلا کر دیتا ہے۔

برے سے برا غلام اپنے آقا سے اس طرح پیش نہیں آ سکتا بشرطیکہ وہ
 دالین نہ ہو۔ یہ غیبت نمک حرام جس کے منہ پر چھچک کے داغ ہیں بے حیائی
 کے سبب سے جس کی آنکھیں پھیل گئی ہیں اور دہانہ فراخ ہو گیا ہے اپنے آپ
 کو زہر و مشتری کی طرح سمجھتا ہے۔ ہر طرف کو لپے مٹکاتا ہوا انداز دکھاتا ہوا
 گزرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوش خرامی میں کبک و تندر کو شرماتا ہے۔ میں نے
 اس کا نام اس لئے نہیں لکھا کہ وہ ایک گدا زادہ گنہگار ہے۔ میں اس پر لعنت
 بھیج کر جو داستان کہہ رہا تھا، اس کو پھر شروع کرتا ہوں۔

تفضل حسین خان

فوجیں ہر طرف سے آ آ کر جمع ہو رہی تھیں۔ بادشاہ کا نام لگا ہوا تھا۔ اس
 وجہ سے دور دور کے سرداران فوج اسٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ فرخ آباد کے نامور
 (میرزا) تفضل حسین خان نے جن کو کبھی بادشاہ سے ملاقات کیا و مندی نہیں تھا
 دور ہی سے آستان شاہی کو سجدہ کیا اور خط میں اپنے آپ کو نیاز مند قدیم لکھا۔

خان بہادر خان

خان بہادر خان نے جو گراہ شہرت طلب تھے اور جو بریلی میں کچھ لشکر جمع
 کر کے سردار بن بیٹھا تھا۔ ایک سو ایک اشرفیاں لفرنی ساز و سامان سے آراستہ

نواب یوسف علی خان

چشم بدور خورشید نشان نواب یوسف علی خان بہادر فرماں مولائے راجپور نے جو اس علاقے میں باپ دادا کی جانشینی کا حق ادا کر رہے ہیں، اور انگریزی حکومت کے ساتھ ان کا رشتہ دوستی اتنا مضبوط ہے کہ زمانہ ہزار برس میں بھی کسی طریقے سے اس کو نہیں توڑ سکتا، محبوبہ صوفی زبانی پیام بھیج کر لوگوں کی زبان کو بند کیا۔

واقعات لکھنؤ

لکھنؤ میں جب نوجوان (انگریزوں سے) رشتہ تعلق توڑ لیا (بیشتر) انگریز (دشمن کی) اس آگ سے بچ کر دوسرے مقامات پر اپنے متعلقین کے پاس چلے گئے، لیکن نوجوان کے چند سرداروں نے کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر جلی گارڈ میں قیام کیا جو لکھنؤ کا ایک مشہور مقام ہے اور بہادر کی کے ساتھ دروازے بند کر لئے۔

شرف الدولہ نے جوہڑے واقف کار، اور معاملات کو سمجھنے والے تھے اور جو نوابان اودھ کے زمانے میں وزارت کے عہدے پر سرفراز تھے اس کم تعداد لیکن با شان و شوکت گروہ (انگریز) کو نظر انداز کر کے واجد علی شاہ کے دس سالہ لڑکے کو تخت حکومت پر بٹھا دیا اور اس کو شاہنشاہ ہندوستان کا وزیر اؤ اپنے آپ کو پیشی کار اور نائب وزیر فرض کر لیا۔ اس نامور شخص شرف الدولہ نے گویا ہمارے گھر کو گرفتار دام کر لیا تھا۔ جب یہ سارا کام مکمل کر لیا، ایک منتخب شخص کو مناصب پیشکش کے ساتھ (دہلی) روانہ کر دیا۔ قاصد کیا، دو روز آرام کیا پھر بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ دو صبار قتل گھوڑے دو کوہ صفت

ہاتھی، ایک سواکیس اشرفیاں اور ایک سنہری کلاہ جو رنگ، بزرگ کے نایاب ہوتیوں سے مزین تھی، پیش کی، اور ایک جوڑ بازو بند جس میں میرے جڑے ہوئے تھے ملکہ کی خدمت میں محل میں بھیجا۔

پہساری شان و شوکت، روشنی چراغ کی طرح، جلد ختم ہونے والی تھی۔ گویا دانے کی نظیر اسی رونق کی منتظر تھی، حکومت اودھ کی اس پیشکش کے بعد آئینہ و سکندر اور جام جشید کی ساری داستان ختم ہو گئی، (بمعنی، خوج کے شور و غل سے نصیب کی آنکھیں کھلی ہیں سقین کہ سپر من گشتیں نہیں نہیں شہنشاہ کی قسمت کا ستارہ آہن بلندی پر پہنچ گیا کہ دنیا والوں کی نگاہوں سے پنہاں ہو گیا۔

جائی کر ستارہ شوخ چشمن در زد
 افسر افسد و گردن، رزان اور زو
 خوشید امانیشہ، ہادر گر دشمن
 برج چرخ نہ بینی کہ چنان می لوزو
 جب قسمت کا ستارہ گر دشمن میں آجاتا ہے تو تاج
 کی بھی کوئی قیمت نہیں رہتی، تم نہیں دیکھتے کہ
 تغیر کے خوف سے سورج آسمان پر کیسا کانپتا ہے۔

۱۴ ستمبر

جس دن وہ سبزم قدم قاصد آیا اور بادشاہ نے بندہ پرورد فرمایا، اس کے کل کو پیر کے دن قری مہینے کی چوبیس اہ ستمبر کی چودہ تاریخ کو پہاڑی کے من میں بیٹھے ہوئے (انگریزوں) نے شان و شوکہ کے ساتھ، کشمیری دروائے پر ایسا حملہ کیا کہ کالوں کی فوج کو بھاگتے ہی جی ے

مئی گرز دہلی برون بند داد
 ستمبر بندہ آورد داد

پس از چار ماہ و پچس از چار روز

فرز زندہ شد مہر گیتی مسرور

ہتی گشت دہلی ز دیوانگان

بہروی گرفتند فرز انگان

مئی کے مہینے میں اگر انصاف دہلی سے اٹھ گیا ستھا، تو

مقبّر میں ظلم و ستم کا دور ختم ہو گیا اور انصاف کا

زمانہ واپس آ گیا چار مہینے چار دن کے بعد سورج

آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوا۔ دہلی دیوانوں سے

خالی ہو گئی عقل مند (انگریزوں) نے بہادری کے

ساتھ اس پر قبضہ کر لیا۔

اگرچہ ۱۸ مئی سے ۱۴ مئی تک چار مہینے چار دن کا وقفہ ہے۔ لیکن اس

بنامہ کہ پیر کے دن شہر (انگریزوں) کے ہاتھ سے نکلا ستھا اور پیر ہی کے دن

قبضے میں آیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہر کا ہاتھ سے نکل جانا اور پھر قبضے میں

آ جانا یہ دو دنوں کا کام ایک ہی دن میں ہوئے۔ مختصر یہ کہ فاطمینہ نے راستے

میں جس شخص کو پایا قتل کر دیا شہر کے مالی غائبان اور صاحب عزت و آب و

کی دولت کو بچانے کے لئے نگھوؤں کے دروازے بند کر کے بیٹھ ہے۔

شہر میں بدباطن (دباہیوں) کی جو فوج تھی اس میں سے کچھ لوگوں نے

ہماگ جانے کی نشان دہی اور کچھ لوگوں نے عزت میں آکر لڑنے کی تیاری کی بغیر

اور آوارہ لوگوں کا یہ گردہ شیر دل فاطمینہ سے اُٹھ پڑا۔ یہ لوگ اپنے خیال میں

تو دشمنوں کو قتل کر رہے تھے

لیکن میرے خیال میں وہ شہر کی عزت و آبرو کو برباد کر رہے تھے۔

وہ تین دن تک کشمیری دروازے سے لے کر جوک تک تمام راستے میدان

جنگ بنے۔ دہلی دروازہ ترکمان دروازہ، اجیری دروازہ، یتیموں دروازے

اس فوج کے قہقہے میں رو گئے مجھ مردہ دل کا سہم کدہ اسکان اوسط شہر میں
 کشمیری دروازے اور دہلی دروازے کے درمیان ہے اور میرے مکان سے
 ان دونوں دروازوں کا فاصلہ برابر ہے اگرچہ گلی کا دروازہ بند کر لیا گیا تھا
 لیکن ابھی اتنا حوصلہ باقی تھا کہ دروازہ کھول کر باہر چلے جاتے تھے اور
 کھانے پینے کا سامان لے آتے تھے۔

انگریزوں کی فتح اور مظالم

میں نے ابھی کہا کہ غضبناک شیروں (انگریزوں) نے شہر میں داخل ہوتے
 ہی بے سرو سامان لوگوں کو قتل کرنا اور مکان کو چلانا جائز سمجھا۔ ہاں جس
 مقام کو راکر فتح کرتے ہیں۔ لوگوں پر ایسی سختیاں کی جاتی ہیں۔
 اسی جھٹے اور دشمنی کو دیکھ کر لوگوں کے منہ فٹ ہو گئے۔ بے شمار مرد
 عورتوں کے گردہ جن میں معمولی لوگ بھی تھے اور صاحب حیثیت سبھی۔ انہ
 تینوں دروازوں سے باہر نکال گئے شہر کے باہر جو چھوٹی چھوٹی بستیاں اور
 مفرے تھے، ان میں پناہ گزین ہو گئے۔ اس خیال سے کہ کسی مناسب وقت
 پر شہر میں واپس آجائیں گے یا کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں گے۔
 میرے دل پر نہ خوف و نہ ہشمت کا اثر ہوا اور نہ پائے استقلال کو جنبش
 ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں گناہگار تو ہوں نہیں کہ سنا پاؤں، انگریز بے گناہوں
 کو قتل نہیں کرتے ہیں اور شہر کی آب و ہوا ناسازگار نہیں ہے مجھے کیا پڑی
 ہے کہ ان بدغیالیوں کو دل میں جگہ دوں اور ادھر ادھر جاگتا پھروں۔
 (اب) مکان کے ایک گوشے میں بے سرو سامانی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں۔
 (اس تنہائی میں) قلم میرا رفیق ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں اور قلم سے
 دردناک الفاظ پٹکتے ہیں۔

پر تھی دستم دلی برگ نوا یا تا چہ بند
 بسن سناد خوم کاہن گہرا ز کان منت

میں بالکل مفلس اور بے سروسامان ہوں
خداوند! کب تک یہ سوچ سوچ کر خوش
ہوتا رہوں گا کہ یہ جو اہر (کلام) میری
ہی کان کے ہیں۔

ازل کا لکھا ہوا بدل نہیں سکتا۔ ازل میں تسعین لکھی جا چکی ہیں ہر ایک
کو نوشتہ قسمت کے مطابق سروسامان عطا کیا گیا ہے مصیبتیں اور راحتیں
اسی حکم ازل کا نتیجہ ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ بے دلی سے جگری کو چھوڑ کر جس طرح
بچے ہر تماشے کو خوشی کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ ہر لمحہ بدلنے والے زمانے کی حیرت
افزائیں نیکیوں کو اس بڑھاپے میں خوشی کے ساتھ دیکھنا رہوں۔

۱۸۔ متمبر

تجدد کے دن محرم کی ۲۶ تاریخ سنی اور شہری کی ۸ راتوں چڑھے دنیا کو خوشی
بخشنے والا آفتاب عالم تاب بر سنبلہ کے ایک دپے میں پہنچ کر کسوف میں
آگیا اور اہل عالم کی چشم جہاں میں پر تاریکی نے ظلم ڈھایا۔ گمراہ باغی اعدوں
دریوں مشہرے غریبوں کی طرح بھاگنے لگے اور خاتین نے شہر اور قلعے پر
قبضہ کر لیا۔ گشت و خون اور پکڑ دھکڑ کی (آفت) اس لمحے تک آگئی۔ خوف
سے لوگوں کے دل دہل گئے۔

کوچے کی در بندی

اس گلی میں صرف دس بارہ گھر ہیں اور راستہ ایک ہی طرف سے پسے دھکی
اندھے بندھے، گلی میں کوئی کنواں نہیں ہے۔ (اس گلی کے) زیادہ تر مہنے
والے بنے گئے ہیں (اس طرح کہ عورتیں بچوں کو چھاتی سے لٹکے ہوئے ستیوں کو
مردوں کے گاندھوں پر سامان کی گٹھڑیاں ستیوں۔ کچھ لوگ باقی رہ گئے تھے ہم

سب نے مل کر گلی کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اور پھر چن دئے گلی سرپستے
 تو کھلی ہی۔ درپستہ بھی ہو گئی۔ (ایک راستہ سخاوت بھی بند ہو گیا)۔
 جہاں اگر خستہ ترازقن ہو دم نیست شگفت
 زان کہ دل تنگ تراز گوشت زندان منست
 میری روح جسم سے زیادہ حسرت و در ماندہ ہو تو تعجب
 کی بات نہیں، کیوں کہ میرا دل قید خانے کے گوشے
 سے بھی زیادہ تنگ ہے۔

مہاراجہ پٹیالہ کی مدد

(اتفاقاً) اس مصیبت میں کام بخنے کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ ننگ
 مرتبہ مرزا خشم راجہ نرندر سنگھ بہادر فرما کر لائے پٹیالہ اس جنگ میں (انگریزوں)
 فاسخین کے ساتھ ہیں اور ان کی فوج شروع سے انگریزوں کی لشکر کی مدد کا ہے
 راجہ کے چند ملازمین خاص جوان
 ادبچے عہدوں پر ہیں اور شہر
 کے نامور اور قابل عزت لوگوں میں سے ہیں (میری مراد) ہے حکیم محمود خان
 حکیم مرتضیٰ خان، حکیم غلام اللہ خان (سے) جو حکیم شریف خان جنت مکان کی
 اولاد میں ہیں۔ اس کو چھ برس پہلے ہیں۔ دوزخ ان کی دو روئے عمارتیں چلی
 گئی ہیں۔ میں سو سال سے ان میں سے ایک صاحب جاہ و ثروت کا بیٹا ہوں
 ہوں۔ ان تین حضرات میں سے اول الذکر حکیم محمود خان مستحقین اور اہل
 خانہ کے ساتھ اپنے بزرگوں کی طرح باحوریت زندگی بسر کرتے ہیں اور باقی دونوں
 حضرات پٹیالے میں راجہ کی مصاحبت میں کامیابی و کامرانی کے ساتھ رہتے
 ہیں۔

جونکو دہلی کی فتح متوقع تھی۔ راجہ نے ازراہ بندہ پروری طاقتور اور
 جنگجو (انگریزوں) سے ملے کر لیا سخاوت حب (شہر) فتح ہو گا اس گلی کے

دروانیہ پر محافظ مقرر کر دیئے جائیں گے تاکہ انگریز فوجی جن کو گور لکھتے ہیں گھروں کو نقصان نہ پہنچائیں۔

اٹلئے کلام میں کبھی کبھی (مجبوراً) چند دوسری باتوں کا تذکرہ بھی آ جاتا ہے اس ضمنی باتوں کے بعد دیں، پھر اصل موضوع پر آتا ہوں۔ سامنے شہر میں ۱۵ ستمبر سے ہر گھر کا دروازہ بند ہے۔ دکاندار اور خریدار دونوں غائب ہیں۔ نہ گندم فروش ہے نہ گیہوں خریدیں۔ نہ دھوبی ہے نہ کپڑے دھونے کو دیں۔ حمام کو کہاں ڈھونڈیں کہ سر کے بال تراشے اور ہنٹر کو کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں کہ صفحہ ۲۱ کے بھر حال جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے۔ ان پانچ دلوں میں (گلی کے لوگ) باہر نکل کر پانی تو برابر لے آتے تھے کبھی کبھی آٹا وغیرہ بھی مل جاتا تھا لیکن اس کے بعد یہ صورتحال ختم ہو گئی، گلی کا دروازہ پتھروں سے بند کر لیا گیا اور دلوں کے آئینے پر عزم و الم کا غبار چھا گیا ہے۔

ہنگامہ گرم سازی کو خش سجا نمائد
نحوں، جھنناں پر آتش سوزان برابر است
کوششوں کے سامنے ہنگامے شندے پڑ گئے اب
معیشتیں خوں کو آگ کی طرے ہلا رہی ہیں۔

پانی اور غلے کا قحط

گھروں میں کھانے کا جس قدر سامان متعارفہ رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔ پانی اگرچہ بے حد احتیاط سے پیا گیا لیکن آخر کار کوڑے یا گھٹڑے میں ایک قطرہ نہیں رہا۔ خورقوں مردوں میں سے کسی میں برداشت کی طاقت نہیں رہی جس کے سامنے دن گزارنے اور (اپنے آپ کو) سامان خورد و نوش حاصل کر لینے کا فریب دینے کا وقت بھی گزر گیا دو شبانہ روز سب سہو کے پیلے لپے ہے۔

فریاد ازاں زاری و خونابہ منشانی
فریاد ازاں خواری و لہر گم نوانی
فریاد ہے چہارگی و خستہ درونی
فریاد ز آوارگی و بے سرو پائی

انسوکس ! یہ گریہ و زاری اور ذلت و محتاجی صد جہف !

یہ بے چہارگی و پریشانی حالی اور بے سرو سامانی :

تیسرے دن جیسا کہ اس سے قبل ذکر آچکا ہے، ہمارا جہ (پٹیل) کی فوج کے سپاہی آگئے اور پہرہ دینے لگے۔ گلی کے پہنے والوں نے لوٹ مار کرنے والوں کے عہد سے بجات پائی : ہر صہ بادا باد " کہتے ہوئے پہرہ داروں سے باہر جانے کی اجازت چاہی یہ پہرہ اندراہ دوستی ستھانہ کہ اندراہ دشمنی۔ اس لئے یہ کہا گیا کہ چوک کے بازار تک جاسکتے ہیں چوک کے آگے قتل و خون کا بازار گرم ہے اور راستہ پر خطر ہے۔

مجبور و پریشان مال لوگوں نے دروازہ کھول دیا۔ بہشتی یا مشک کا ملنا ناممکن تھا۔ اس لئے ہر گھر سے ایک مزداد و میرے ملازمین میں سے دو شخص گئے۔ میٹھا پانی دور تھا اور اتنی (دور جا نہیں سکتے تھے۔ مجبوراً نیم شور پانی مشکوں اور گھڑیوں میں بھر لئے اس طرح اس تکبیل پانی سے وہ آگ بھی جس کا دوسرا نام پیاکس ہے۔

باہر جانے والے اور پانی لانے والے لوگ کہتے تھے کہ اس گلی میں جس سے آگے جانے کی ہم کو اجازت نہیں ہے۔ سچا ہیون نے کچھ مکالوں کے دروازے توڑ ڈالے (ان گھروں میں) نہ تو بوسے میں آٹا ملا نہ برتن میں روغن، میں نے کہا اچھا بندہ وہ ہے جو برتن، تھیلے، آٹے اور تیل کا ذکر نہ کرے۔ ہمارے روزی تو ایسے (روزی رساں) کے ذمہ ہے جو ہم کو نظر انداز نہیں کرے گا خدا کی بخشش کا شکر نہ ادا کرنا شیطنیت ہے۔

آج کل ہم لوگ اپنے آپ کو قیدی سمجھ رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ بالکل قیدیوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ نہ تو کوئی آتا ہے کہ کوئی بات سُنے کو ملے۔ نہ خود باہر (جاسکتے) ہیں کہ اپنی آنکھوں سے سائے واقعات دیکھیں یقیناً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے کان بہرے ہیں اور آنکھیں بے نور، اس کشمکش کے علاوہ نہ کھانے کو روٹی ہے نہ پینے کو پانی۔

ایک دن اچانک بادل آگیا۔ پانی برسنا ہم نے (صمن میں) ایک چادر باندھ لی اور ایک ٹسکا اس کے نیچے رکھ دیا اور (اس طرح) پانی حاصل کیا چکا ہے کہ بادل دریائے پانی لیتا ہے اور زمین پر برساتا ہے (لیکن) اس پار یہ ہمارا صفت بادل پانی چشمہ حیوان سے لایا۔ گو یا سکندر نے جو چیز اپنی باوشاہت کے دور میں ڈھونڈی تھی۔ مجھ پر پشانا مال نے وہ دولت (آپہ حیات) (اس) تباہی و بربادی کے عالم میں پائی ہے

غالب بنود کو تازہ از دوست ہمانا

ز انسان دہم کام کہ بسیار ندانم

لے غالب! دوست کی طرف سے کہیں کو تاہی نہیں ہوتی۔

(البتہ) وہ اس طرح کام بناتا ہے کہ ہم سمجھ نہیں پاتے ہیں۔

سوانح غالب

اس موقع پر میں چاہتا ہوں کہ کچھ اپنی زندگی اور اشغال کے متعلق بھی لکھوں۔ اس طرح کہ یہ سرگزشت سلسلہ کلام سے غیر متعلق نہ ہونے پائے۔

مرہم ز دایح تازہ بزخم جب گرم

پیکان زول بکاوش نشر برآدم

میں نئے داغوں سے زخم ہائے جگر پر مرہم رکھ رہا ہوں اور
میں نشر کی مدد سے دل سے پیکان نکال رہا ہوں۔

اس سال میری زندگی کا با شمعواں سال شروع ہوا۔ (اتنی مدت ہے) میں اس دنیا کی خاک چھان رہا ہوں اور پچاس برس سے شعر و سخن میں معروف و نامور ہوں۔ میری عمر پانچ سال کی تھی کہ میرے والد عبداللہ بیگ خان بہادر کا انتقال ہو گیا خدا ان کی روح پر بے شمار رحمتیں نازل کرے میرے چچا نصر اللہ بیگ خان بہادر نے مجھ کو اپنا بیٹا بنا لیا اور لاڈ پیار سے پرورش کی جب میری عمر نو سال کی ہوئی تو میرے چچا جو میرے سرپرست بھی تھے۔ موت کی گھری نیند سو گئے (گویا) میری قسمت سو گئی۔

(میرے یہ) لائق تعریف و صاحب مہار و جہمت (بزرگ) چار سو سواروں کے سردار اور جنرل لارڈ لیک بہادر کے وفادار متعلقین میں سے تھے۔ اس خانہ اور سختی سرور کی مہربانی سے وہ اگرہ کے قریب دو پرگنوں کے حاکم اور مالک تھے ان کے انتقال کے بعد وہ (دو) دولوں پر گئے انگریزی حکومت نے واپس لے لئے اس جاگیر کے بجائے میرا اور میرے حقیقی بھائی کا کچھ وظیفہ مقرر کر دیا گیا جو میری آرام و بکاشت کا ذریعہ تھا۔ چنانچہ اس سال یعنی ۱۸۵۷ء میں اپریل تک کا وظیفہ مکمل شدہ دہلی کے خزانے سے میں نے حاصل کیا جس سے اس خزانے کا دروازہ ہی بند ہو گیا۔ (اب) میں بد نصیبی سے دو چار ہوں اور دل طرح طرح کے خیالات پریشان کا مسکن ہے۔

اس سے پہلے صرف وہی تھی نہ کوئی دلا کا خدا نہ لڑکی، تقریباً پانچ سال پہلے کہ میں نے اپنی بیوی (جو میری تنہا ہی کی ذمہ دار ہے) کے خاندان کے وہ بے ماں باپ کے بچوں کو لے کر پال لیا ہے۔ ان شیریں زباں بچوں سے مجھ کو بے انتہا محبت ہے۔ اس عالم بے چارگی میں (دو دولوں پہنچے) میرے ساتھ ہیں اور میرے دامن و گریبان کے سچول ہیں۔

مرزا یوسف

سبحانی جو دوسال مجھ سے چھوٹا ہے تیس سال کی عمر میں دیوانہ ہو گیا تیس برس سے وہ اس طرح زندگی گزار رہا ہے کہ نہ کسی کو سنا سکتا ہے نہ شور و غل کرتا ہے اس کا مکان میرے گھر سے تقریباً دو ہزار قدم کے فاصلے پر ہے۔ اس کی بیوی اور دیکھنے والے بچوں اور کنیزوں کے ساتھ سجاگ جانے ہی میں مافیت سمجھی۔ گھر کے خازن العقل مالک اور سائے سامان کو ایک بوتل سے دربان اور ایک بڑھیا کنیز کے ساتھ چھوڑ دیا۔

اگر میں جادو جانتا ہوتا تب سبھی (ان حالات میں) میں کسی کو بھیج کر ان تینوں آدمیوں کو نہ بلوا سکتا تھا، نہ سامان منگوا سکتا تھا۔ یہ بہت بڑا حتم ہے اور میرے دل پر اس کا بہت اثر ہے۔

وہ دو دنوں ناز پروردہ بچے پتلی، دودھ، مٹھائی مانگتے ہیں لیکن ان کی خواہش پوری کرنا میرے بس میں نہیں۔ افسوس! افسوس! اس ایک بات کو کیا کہوں۔ جب تک زندہ ہوں، روٹی اور پانی کی فکر ہے گی اور مرنے کے بعد کفن و دفن کی۔ میں دن رات اس فکر میں رہتا ہوں کہ سبحانی نے دن میں کیا کھایا (چوگام اور رات میں کیسے سویا (چوگا) اور لعالات سے) ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا ہوں کہ (سبحانی) زندہ بھی ہے یا مصیبتیں (اشاعتے) اٹھاتے مر گیا۔ (۱)

نہ ہمیں نالہ و فغان بلسم

من و جان آفرین کر جان بلسم

میرے ہونٹوں پر صرف آہ و فغاں نہیں ہے

خدا کی قسم (اس علم سے) میں جان بلب ہوں

جو حالات میں بیان کئے یہ حال دکھانے والے ہیں لیکن جو کچھ میں کہہ

نہیں سکا ہوں، وہ روح فرسہ ہے جو لوگ حالات سے واقف ہیں میں ان سے توقع کرتا ہوں کہ وہ میری پُر درد داستان کو غول سے ٹھیں گے اور سُکھ انصاف کریں گے۔

میں اس بڑھاپے میں چراغ صبح اور آفتابِ لبِ بام کی مانند ہوں، میرا مطلب چراغ کی روشنی اور سورج کی نور افشانی سے نہیں ہے بلکہ جس طرح صبح کے وقت چراغ کا ردِ غنِ ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے اور اس کی روشنی ہلکی ہو جاتی ہے اور دن ڈھلے سوج کی چمک دمک ماند پڑنا شروع ہو جاتی ہے وہی میرا حال ہے دو سال چوتھے کے میں نے ملکہ انصاف پسند، فلک رفعت، ستارہ حشم، ملکہ دکھڑیہ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا اور ڈاک سے جو دہلی سے براہ راست بمبئی اور وہاں سے لندن جاتی ہے، آٹھلے ہنر پرور ملک نامور لارڈ لن براہادر کے حضور میں بھیجا جو گورنر کے زمانے میں ازراہ وکرم میرے مرقی تھے۔

راہِ سخن کشودم اگر خود شد کہ بخت

راہم بہ بزمِ بالوی گیتی ستاں دہد

یہ شعر اسی قصیدہ کا ہے۔ وہ قصیدہ اسی ردیف تالیف میں ہے کہ خیال تھا کہ ایسا مشکل کام اس آسانی سے بن جائے گا۔ تین پہینے بعد پانچ ایک مُبارک قدم قاصد اس سو پوستانِ سرور سے (لارڈ لن براہ) کا تازہ نامہ لایا۔ یہ خط انگریزی میں تھا۔ نہایت محبت کے ساتھ لکھا تھا کہ قصیدہ جہاں سے پاس پہنچ گیا اور سمجھے اس کو ملکہ معظمہ کے سامنے پیش کرنے کے لئے متعلقینِ بارگاہِ شاہی کے حوالہ کر دیا۔ اس پر مسرت پیغام اور مبارک جواب کو تیس دن گزرنے کے بعد سرورِ مہربان سٹارڈ کلیم براہادر کا گرامی نامہ ڈاک سے آیا، لکھا تھا کہ قصیدہ لارڈ لن براہادر کے واسطے سے جہاں سے پاس پہنچا تھا۔

اس کے بارے میں یہ حکم ہے کہ سائل ضابطے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی گزارشات فرما کر دولۂ ہندوستان کے وسیلے سے ہماری بارگاہ میں پیش کرے۔

غالب کے تین مطالبات

حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ایک معروضہ مشہنشاہ انگلینڈ کے نام (ملکہ کو) سکندر جاہ فریدون ختم لارڈ کیننگ نواب گورنر جنرل بہادر کے حضور میں بھیجا۔ اس گزارش نامے میں التماس و آرزو کو اس طرح پیش کیا گیا کہ روم، ایران اور دوسرے ممالک کے بادشاہوں نے مشاعروں اور مداحوں کو طرح طرح سے نوازا ہے۔ مویوں سے منہ سہر دینا، سونے میں تلوانا، گاؤں عطا کرنا اور انعام دینا، غرض مختلف انداز ہے ہیں۔ اس مداح کی یہ خواہش ہے کہ ملکہ مغلا اپنی زبان (مبارک) سے مہر خوان (خطاب) ارشاد فرمائیں۔ اپنے حکم سے سراپا خلعت بخشیں اور اپنے خوان سے چند نان ریزہ (روٹی کے ٹکڑے) عنایت فرمائیں۔ اور سراپا کا ترجمہ حوی میں خطاب اور خلعت ہو سکتا ہے اور نان ریزہ کو انگریج میں پنشن کہہ سکتے ہیں۔

حاکم بلند مرتبہ نواب گورنر جنرل بہادر نے جواب میں میرے دل مند کو بشارتِ مدا سے ارشاد فرمایا (موصوف) نے لکھا کہ (وہ) ستائش نامہ انگلستان روانہ کر دیا گیا۔ اس خبرِ مسرت سے میں ایسا مسرور ہوا کہ مجھے میں بھولا نہیں سماتا تھا۔

مالی کوس کن جواب

ہمارے ماہ کے بعد میرے خط کے جواب میں فرخ شہنائی مالی نسب مسٹر میل کلرک بہادر کے غمازہ مشک بار کا لکھا ہوا موصوف نامہ (موصول ہوا) اس (جواب) امید داری اور آرزو مندی کی مدت کو اور بڑھا دیا۔

میں جانتا ہوں کہ اگر ہندوستان کا نظم و نسق (فدرمیں) تباہ نہ ہوتا اور
 ناخدا ترس اودنا مشکرے سپاہیوں کے ہاتھوں عدالتیں نہ اُچڑ جاتیں تو گستاخ
 انگلستان سے ایسا خرمان صادر ہوتا جس سے مرادیں پوری ہو جاتیں اور
 میری آنکھیں اور میرا دل دونوں ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ۔

اب وہ مبارک خطوط جو میری پر جوش آرزوؤں کی فہرست ہیں اور
 میرے جوش و خروش کے بازو کا تعویذ میرے پاس ہیں۔ اور جگر کے چند ٹکڑے
 جو جوش گریہ میں آنکھوں سے ٹپکتے ہیں جگر خراشی و خون نشانی کے نشانی
 کے طور پر میرے دامن میں ہیں ۔

فی کشتہ زخم ناوک و شمشیر م
 فی خستہ ناخن پلنگ و شیر م
 لب می گزم و خون بزبان می لیم
 خون می خوم و ز زندگانی سیر م
 میں تیرا تلوار کا زخمی نہیں ہوں۔ نہ پلنگ و شیر نے
 مجھے مجروح کیا ہے۔ میں (شدت غم میں) اپنے ہونٹ
 کاٹا ہوں اور زبان کو خون آلود کر لیتا ہوں۔ خون بہا کر
 کھاتا ہوں اور زندگی سے بیزار ہوں ۔

مرزا یوسف کے گھر کی تارا جی

مقبور کی اکتیسویں تاریخ کو بدھ کے روز شہر کی فتح اور گلی کا دروازہ بند
 کرنے کے سترہویں دن لوگ خبر لائے کہ لوٹ مار کونے والے بھائی کے گھر میں
 چڑھ دوڑے۔ گلی اور گھر میں لوٹ مار کی، دپلنے مرزا یوسف خان اور دونوں
 بڑھیا کینز (ماما) دونوں نے ان ہندوؤں کی مدد سے کھانے پینے کا انتظام
 کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ۔

واضح ہو کہ اس پکڑ دھکڑ اور قیامت کے عالم میں جس طرح ہر کوچے اور بازار میں اس معیبت کی صورت یکساں نہیں ہے۔ اسی طرح قتل کرنے اور لوٹ مار میں بھی سب سپاہیوں کا انداز ایک نہیں ہے۔ اگر کوئی سپاہی رحم کرتا ہے یا دوسرا سختی کرتا ہے تو یہ ذاتی رحم دلی سنگدلی کا نتیجہ ہے۔

انگریزی سپاہیوں کی معقولیت اور امن پسندی کا اعتراف

• میں جانتا ہوں کہ اس یلغار میں حکم یہ ہے کہ جو شخص اہل ابرار طاعت کو قتل نہ کیا جائے، مال چھین لیا جائے اور جو شخص مقابلہ کرے مال کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی بھی چھین لی جائے۔ مقتولین کے متعلق یہ خیال ہے کہ انہوں نے یقیناً اطاعت نہیں کی۔ اسی وجہ سے ان کو قتل کر دیا گیا۔ مشہور بھی یہی ہے کہ عموماً سامان لوٹ لیتے ہیں قتل نہیں کرتے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے اور وہ بھی صرف دو تین کوچوں میں کہ پہلے قتل کر دیا پھر سامان لوٹ لیا۔ (البتہ) بوجھوں، سورتوں اور بچوں کا قتل روا نہیں رکھا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر تو سب غامدگ کیا۔ اب میں ایک پرورد آواز بلند کروں کہ سمنو قلم قدم آگے بڑھئے۔ لمے انصاف کی تعریف کرنے والے اور ظلم کو برا کہنے والے حق پرستو! اگر ظلم کی مذمت اور انصاف کی تعریف میں تمہاری زبان اور سہارا دل ایک ہے تو خدا کے واسطے ہندوستانیوں کا طرز عمل یاد کرو اس کے بغیر کہ پہلے سے دشمنی کی کوئی بنیاد اور مداوت کا کوئی سبب ہو (ان ہندوستانیوں نے) اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اٹھائی ہے چاری عورتوں اور گھوڑوں میں کھیلنے ہوئے بچوں کو قتل کیا (حالانکہ) سب جانتے ہیں کہ اپنے آقا سے بد وفائی کرنا گناہ ہے (اس کے مقابلے میں) ان انگریزوں کو جب لوشن کا بدلہ لینے کے لئے رٹنے والے آئے اور گناہگاروں کو سزا دینے کے لئے لشکر آراستہ کیا۔ چونکہ وہ (شہر والوں سے) بھی برہم تھے تو موقع تو اس کا سنا

کہ شہر پر قابض ہونے کے بعد کتنے فنی حکم کو زندہ نہ چھوڑتے، لیکن انہوں نے ضبط کیا۔ (اگرچہ ان کے سینے میں غصہ کی آگ بھڑک رہی تھی، عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔ یہ جو گھس بار اور جان مال محفوظ رہنے کی ذمہ داری نہیں لی گئی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ بے گناہوں اور گناہگاروں سے میں امتیاز نہیں جن لوگوں کو باز پرس کے لئے بلایا گیا ہے۔ ان کے سوا اور کسی کو حاضر ہونے کی اجازت نہیں دی ہے۔

شہر کے بیشتر لوگوں کو باہر نکال دیا ہے کچھ لوگ بہ دستور امید دیم میں گرفتار (شہر کے اندر) موجود ہیں، جو (لوگ شہر سے نکل کر) دیوالوں اور گوتھوں میں مقیم ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں ابھی کوئی علم (صادر) نہیں ہوا، جو لوگ (شہر سے) باہر نکل گئے ہیں یا جو شہر کے اندر مبتلائے پریشانی ہیں، ان کے درد کا کوئی سداوا نہیں ہے۔ کاش (شہر کے) اندر رہنے والے اور (شہر کے) باہر رہنے والے ایک دوسرے کی زندگی و موت سے واقف ہوتے کہ بے تابی و پریشانی نہ ہوتی۔ بس یہ جانتا کافی ہے کہ جو جس جگہ ہے پریشان ہے شہر کے اندر رہنے والے مجبور لوگ ہوں یا باہر کے پریشان مال و سب کے دل سے درد سے بھرے ہوئے ہیں اور سب قتل و غارت کے خوف سے ہراساں ہیں۔

کرنل براؤن کے سامنے پیشی

حد اکثر کا پیر کا معیت آخری دن تھا۔ دوسرے وقت اچانک چند گورے اس دیوار پر چڑھ گئے جو بند کردہ دروازے سے ملتی ہوئی ہے (وہاں سے) ایک جھت پر (اور چھت سے) کود کر گلی میں آگئے۔ راجہ نرندر سنگھ کے سپاہیوں کا روکنا (کچھ) مفید نہیں ہوا (نہیں روک سکے) دوسرے چھوٹے چھوٹے مکانات کو نظر انداز کر کے راقم الحروف کے گھر میں (گھس) آئے۔ (ان کو دس دس) سبیل منس سے سامان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مجھ کو ان دونوں بچوں، دو

تین ملازمین اور چند نیک کردار پڑوسیوں کے ساتھ گلی سے دو فلائنگ سے
بچھ فاصلے پر حقیقت پسند دانشور کرنل براؤن کے پاس لے گئے جو چوک سے
اسطرت قطب الدین سوداگر کی حویلی میں مقیم ہے (کرنل براؤن نے) مجھ
بہت نرمی اور انسانیت سے بات چیت کی۔ مجھ سے نام اور دوسروں سے پیشہ
پوچھا۔ خوش اسلوبی کے ساتھ اسی وقت رخصت کر دیا۔ میں نے خدا کا شکر
ادا کیا۔ اس خوش اخلاق و کرنل براؤن کی تعریف کی اور چلا آیا۔

۷ اکتوبر

۷ اکتوبر کو شام کے وقت ۲۱ توپوں کی آواز نے (قوت) سامع کو نوازا
اور آگہی کو خرقہ حیرت کر دیا (میں سوچنے لگا کہ) لقیئت گورنر بہادر کے آنے
پر سترہ توپوں کی سلامی دی جاتی ہے اور لوا ب گورنر جنرل بہادر کے آنے پر انیس
توپوں کی۔ اکیس توپوں کی خوش افزا سلامی کی کیا وجہ ہے دوسرے دن بھی نہ
اس ناداقیت میں کوئی کمی ہوئی نہ معلومات میں کچھ اضافہ ہوا میرا خیال
ہے کہ ملک کے پست و بلند کو ہوا رکھنے والے (انگریزوں) کو کسی دوسری جگہ
بایںوں پر فوج حاصل ہوئی ہے۔

واضح ہے کہ ابھی بایںوں کے بہت سے گروہ بریلی، فرخ آباد اور لکھنؤ میں
جگہ جگہ غور و خوض پھیلانے اور بے فائدہ مقابلہ کرنے میں مصروف ہیں، اور ان
کے دل، کہ خدا کرے خون ہو جائیں، اور ان کے ہاتھ کہ خدا کرے کہ بیکار ہو جائیں
اسی کام (مطامی) کے لئے کھیلے ہوئے ہیں۔

میسواتیوں کی شورش

ادھر موہنہ اور لڑہ کے علاقے میں میسواتیوں نے بے طرح شورش پھیلایا
رکھیں نہیں جیسے دیوانے زنجیروں سے آزاد ہو گئے ہوں۔ تلام نامی ایک شورش

پندرہ کچھ دن تک ریواڑی میں ہنگامہ آرا رہا۔ پھر شیطان کی رہنمائی سے میواتیوں سے مل گیا یہ گروہ میدانوں اور پہاڑوں میں (انگریز حاکموں سے برسرِ جنگ ہے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر ہر طرف تیز آنکھوں اور ہر قسم کی ہولی آگ کے ہنگامے بپا ہیں۔

ان غم انگیز حالات میں جن کا آغاز یاد نہیں ہے اور جن کا انجام معلوم نہیں ہے رونے کے علاوہ کچھ دیکھا ہوتا تو آنکھوں کے دوزخِ خاک سے سہرا نہیں۔ روزِ سیاہ (بد نصیبی) کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں۔ جس کے متعلق کہوں کہ آنکھوں نے اس کو دیکھا۔ اس سے قطع نظر کرتے ہوئے اکہتا ہوں کہ روزِ سیاہ (بد نصیبی) تو وہ چیز ہے جس کی تاریکی میں کچھ دیکھا ہی نہیں جاسکتا۔

خانہ نشینی

جس دن گویے مجھے پکڑ مار لے گئے تھے۔ اس دن کے علاوہ جو کھٹ پر قدم رکھنا، گھر سے باہر نکلنا، گلی یا بازار میں چلنا یا دور سے چوک کو دیکھ لینا نصیب نہیں ہوا ہے گویا گنجہ کے دانشور (نظامی گنجوی) نے میری ہی زبان میں کہا ہے

ندامت کہ گیتی چساں میرود

چہ نیک و چہ بد در جہاں میرود

میں نہیں جانتا ہوں دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

کیا اچھائی ہو رہی ہے کیا بُرائی۔

ان لاعلاج غموں اور مرہم بزارِ رنجوں (کے ہوتے ہوئے تو) مجھ کو یہ سوچنا

چاہیے کہ میں مر چکا ہوں۔ مجھ کو باز پرس کے لئے اٹھایا گیا اور جزائے اعمال بد کے

نیچے میں دوزخ کے کنوئیں میں لٹکا دیا گیا ہے مجھ کو اس قید میں بے چارگی و

پریشانی کے ساتھ ہمیشہ جینا پڑے گا۔

آہ گر باشد ہمیں امروز من فردا میں
 مجھ پر جو کچھ آج گزر رہی ہے۔ اگر کل بھی یہی
 گزری (تو) آہ (کیا ہوگا)

کیفیتِ روزنامہ شماری

اس کتاب میں شروع سے آخر تک یا ان حالات کا ذکر ہے جو مجھ پر گزریے
 ہیں یا ان واقعات (کا ذکر) جو گا جو مٹنے میں آئے ہیں۔ میں نے جو شدید حالات
 کئے ہیں تو کوئی یہ خیال نہ کرے کہ میں نے جھوٹ باتیں سنیں ہونگی یا کچھ کم کر کے۔
 کس جوں گی۔ میں ناروغی سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں اور سچائی میں بننا سکتا
 ڈھونڈتا ہوں آنکھیں بے کار ہیں، دل قیدِ دھن میں ہے اور لبِ سالک ہیں۔
 لوگوں کی زبانوں سے میرے کانوں کو معلومات کی سبک ملتی ہے کیسی بری ہے یہ
 گدائی! اور وہ بھی اس بے سرو پائی کے ساتھ۔

اور یہ جو بادشاہ اور شاہ زادوں کے انجام کے متعلق میں نے جو کچھ نہیں لکھا
 (علاحدہ ان واقعات کو) فتح شہر کی داستان کے دیباچہ کے طور پر (آغاز ہیں
 میں) کھٹنا چاہیے تھا۔ اس کی بھی وجہ ہے کہ اس تحریر کے سلسلے میں میرا
 سارا سرمایہ سخن ہائے شدید ہیں اور اسی بغیر سنی ہوئی باتیں بہت ہیں یقیناً
 جب میں اس جلتے تنگ سے باہر نکلوں گا جو باتیں اب تک نہیں سنی ہیں
 ادھر ادھر سے جمع کروں گا اور تب واقعت کاروں کی طرح یہ ماز کی بات لکھوں
 گا میں امید کرتا ہوں کہ اس تحریر کے پڑھنے والے (واقعات) داستان کی تقدیم
 و تاخیر پر از روئے انصاف اعتراض نہیں کریں گے۔

۱۹ اکتوبر

۱۹ اکتوبر کو پیر کے دن جس کا نام ہفتے کے رجسٹر سے کاٹ دینا چاہیے آتش

نشان اڑھے کی طرح دُنیا کو بنگل لیا۔ اسی دن صبح کے وقت وہ کچخت دُہان بھائی کے مرنے کا خوشخبری لایا۔ کہتا تھا کہ وہ گرم رفتار راہِ فنا (یوسف مرزا) پانچ دن تیز بخار میں مبتلا رہا اور آدھی رات کے قریب اس دُنیل سے رخصت ہو گیا۔ پانی، رومال، عسال، گورکن، اینٹ مچوٹے، گائے دھنڑ کا ذکر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ میں کیسے جاؤں اور (میت کو) کہاں لے جاؤں۔ کس قبرستان میں سپرد خاک کروں۔ بازار میں اچھا برا کسی قسم کا کپڑا نہیں ملتا ہے۔ زمین کھودنے والے مزدور گویا کبھی شہر میں تھے ہی نہیں۔ ہندو اپنے مردوں کو دریا گنا لے لے جا کر جلا سکتے ہیں (لیکن) مسلمانوں کی کیا مجال ہے کہ وہ تین شخص ساتھ ساتھ راستے سے گزریں۔ چہ جائیکہ میت کو شہر سے باہر لے جائیں۔

مرزا یوسف کے کفن و دفن کا انتظام

بڑوسیوں نے میری تنہائی پر رحم کیا اور (اس) کام کو انجام دینے کے لئے تیار ہوئے۔ چٹالے کے ایک سپاہی کو آگے کیا۔ میرے دو لوگوں کو ساتھ لیا اور چل دیئے۔ میت کو غسل دیا۔ دو تین سفید چادریں میاں سے اگھر، لے گئے تھے ان میں لپیٹا اور اس مسجد میں جو مکان کے برابر تھی زمین کھودی۔ (قبر بنائی) میت کو اس میں رکھ دیا اور گڑھے کو پاٹ کر لوٹ آئے۔

دریغ آں کہ اندر ورنگ مرعلیت

سہ وہ شادوسی سال شاد زلیت

تہہ خاک بالیں رختش نہ بود

خدا یا برہم مرد

خدا یا برہم مردہ بنشیش

کہ نادیدہ در زلیت آسایش

سروش بدل جوئی ادفست

روانشن بجا دید میوز قست

اضحیٰ کے ساتھ سال کی عمر میں (دو) تیس سال
 شاد رہا اور تیس سال کی ، قبر میں اس کو بالمش
 نعت بھی نہ ملا ، خاک کے علاوہ اور کچھ اس کی
 قسمت میں نہیں تھا ، لئے خدا اس مرنے والے
 پر رحم کر کے اس نے زندگی میں آرام (کی صورت)
 نہیں دیکھی ، اس کی دل جوئی کے لئے کسی فرشتے
 کو بھیج اور اس کی روح کو بہشت میں داخل کر۔

یہ نیک سرشت لیکن بد قسمت شخص جس نے زندگی کے ساتھ سال خوش
 دوش گزارے۔ تیس سال ہوش مند کی کے ساتھ اور تیس سال بے ہوش
 دیا لگی کے عالم میں۔ زمانہ ہوش مند میں غصہ ضبط کرنا اور عالم دیوانگی
 میں کسی کو تکلیف نہ پہنچانا جس کا شعار تھا۔ ۲۹ صفر سنہ ۱۲۷۳ھ کی شب
 میں مر گیا۔

نصاب مرگ بتم دیدہ میرزا یوسف
 کہ نیستی بجاں در ز خویش بیگانہ
 بیک در انجمن از من ہی بخرویش کرد
 کشیدم آہی و گفتم دریغ دیوانہ
 ایک شخص نے مجھ سے ستم نصیب مرزا یوسف کی تاریخ
 (وفات) پوچھی ، جس نے اس دنیا میں اپنے سے بیگانہ
 ہو کر زندگی گزاری۔ میں نے ایک آہ کھینچی اور کہا:
 ”دریغ دیوانہ“

تاریخ وفات مرزا یوسف

واضح ہو کہ ”دریغ دیوانہ“ سے ۱۲۹۰ عدد حاصل ہوتے ہیں۔ اگر ان میں

سے ۳۰ لاکھ ۱۶ عدد نکال دیئے جائیں تو ۱۲۷۳ (ہجری) بابت بس جو
مطلوب ہیں۔

بنام آنکھ پور شس درخور لوست
بہر جا سرشود آری در اوست
اس خدا کے نام جس کے حضور میں معذرت کمرنا ہی
مناسب ہے۔ تم جہاں سر جھکاؤ گے، اس کا
آستانہ ہوگا۔

فرماں روانے لوہار کی تباہی

بِس ہفتہ انگریزی خوج نے شہر کو خرچ کیا اس ہفتے ناموران دانش
مند امین الدین احمد خان بہادر محمد ضیا الدین خان بہادر نے حفظ وضع کی
نظار اور امید بہتری پر شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ بڑی بچوں کے علاوہ تین
ہاتھی اور چالیس گھوڑے ساتھ تھے۔ ہر گزٹ لوہار کا رخ کیا جو ان کی آبائی
جاگیر ہے۔ پہلے مہرولی گئے اور اس گورستان پر الفار (مقبرہ) میں قیام کیا۔
دو تین روز آرام کی۔ اس دوران میں لیٹے سپاہیوں نے قیام گاہ کو گھیر لیا جو کٹے
ہئے ہوئے تھے، ان کے علاوہ سارا سامان چھین لیا اور چلے گئے البتہ ان تینوں
ہاتھی جن کو وفادار اور خیر خواہ سمجھا ہی اس لوٹ مار کے شروع ہوتے ہی نکال
لے گئے تھے۔ تباہی و نقصان کے نشان کی حیثیت سے باقی رہ گئے جیسے تین
چلے ہوئے خرمن ہوں۔

(یہ لوگ) لوٹ مار کی مصیبت استخار (اس) ہے سرور سامانی کے ساتھ
جس کو تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو (ریاست) دوجانہ کی طرف روانہ ہو گئے۔
دوجانہ کے نامور اور نیک کردار (مزاں روا) حسن علی خان بہادر نے اذراو
نسایت و قیاض۔ (ان کا) استقبال کیا۔ یہ کہہ کر کہ "میر گھر بھی آپ ہی

کا گھر ہے۔ ان سب کو دو جانے لے گئے۔

قصد منقر میر دار خوش خصال (حسن علی خان) نے اپنے ہم سفر (مہالوں) کے ساتھ وہی سلوک کیا۔ حوشاہ ایران نے جہایوں کے ساتھ کیا تھا۔ صاحب کمشنر بہادر نے (ان حالات) سے واقف ہو کر اپنے پاس بلا لیا (یہ لوگ) شہر میں آئے اور حکم سے ملاقات کی۔ (صاحب کمشنر) نے کچھ دیر طعن و تشنیع کی (لیکن) جب نرم جواب سنا تو پھر کچھ نہیں کہا۔ قلعہ کے اندر ایوان خان سامانی کے پہلو میں چٹھرنے کا حکم دیا۔

تسلیم کلام کی رعایت کی وجہ سے میں اس خاندان کی تباہی کے داستان نہیں لکھ سکا۔ یوں سمجھو کہ مہر دلی میں ان لوگوں کو لوٹا گیا اور وہیں میں ان کے مکانات جو مالکوں سے خالی تھے۔ نذر غارت گری ہوئے جو سامان یہ لوگ وہاں (مہر دلی) لے گئے تھے، لوٹ مار کرنے والوں کے حصے میں آیا۔ بس متعلقین زندہ دو جانے پہنچے اور جو سامان یہاں عمارت میں تھا سب لٹ گیا۔ بس انہیں پتھر باقی رہ گئے نہ سیم وزرہ محفوظ رہا نہ لباس و بستر کا ایک تار بچا۔ خدا (ان) سے گناہوں پر رحم کرے اس آغازِ ناسازگار کا انجام بخیر ہو، اور (ان) کو مصیبت کے بعد آرام نصیب ہو۔

حاکم جھمڑہ اور حاکم فرخ نگر کی گرفتاری

یقیناً اکتوبر کی ۱۲ تاریخ تھی اور سچر کا دن کہ یہ دونوں دانش مندان بیٹھا شہر میں آئے اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے قلعہ میں قیام کیا۔ اس واقعہ کے دو تین دن کے بعد نوج کو حکم دیا گیا۔ نوج گئی اور جھمڑہ کے حاکم عبدالرحمن کو بھرموں کی طرح لائی قلعہ کے اندر ایک ایوان کے گوشے میں جس کو دیوان عام کہتے ہیں (چٹھرنے کے لئے) جگہ دی گئی اور ان کی ساری جاگیر انگریزی حکومت نے ضبط کر لی۔

۳۱، اکتوبر کو جمعہ کے دن فرخ نگر کے حاکم احمد علی خان کو اسی طرح (گرفتار کر کے) لائے جیسے عبدالرحمن خان کو لائے تھے اور قلعہ دہلی میں ایک الگ جگہ ان کو ٹھہرایا گیا۔ فرخ نگر میں تیز دست تباہ کاروں کا نشان بنا اور شہر والوں کا مال و اسباب کٹ گیا۔

حاکم بہادر گڑھ اور بلب گڑھ کی گرفتاری

۴ نومبر کو پیر کے دن دلاوری اور بہادر گڑھ کے حاکم بہادر جنگ خان گرفتار ہو کر آگئے اور قلعہ میں جہاں ٹھہرایا گیا ٹھہرے۔ ۷ نومبر کو سینچر کے دن راجہ ناہر سنگھ حاکم بلب گڑھ کے آجانے سے قلعہ میں جو سردار مختلف مقامات پر ایک دوسرے سے دور مقیم تھے۔ ان میں ایک کا اور اضافہ ہوا۔ راجہ ہو کر دہلی کی اجنٹی کے ماتحت جو جاگیریں ہیں وہ شمار میں ہفتے کے دوا سے کم یا زیادہ نہیں ہیں (دہلی کے ماتحت سات جاگیریں ہیں) بھجڑ بہادر گڑھ، بلب گڑھ، لوہارو، فرخ نگر، دو جانا، پالوڈی، ان میں سے پانچ جاگیروں کے حاکم جیسا کہ میں نے کہا قطعے میں موجود ہیں اور بقیہ دو جاگیر دار پالوڈی اور دو جانا [ان خوف کے تیر کا نشانہ ہیں۔ دیکھو! ان کی جہاں میں آنکھیں دنیا میں کیا دیکھتی ہیں اور کیا انجام ہوتا ہے۔

یہ بات پوشیدہ نہیں ہے گی کہ مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خان جن کا لقب حسین مرزا ہے، اس ہنگامے میں دوسرے باغوت لوگوں کی طرح چوکی بچوں کے ساتھ شہر سے باہر چلے گئے قیمتی سامان سے بھرے ہوئے گھر چھوڑ دیئے اور صحرا و زردی اختیار کی۔ ان لوگوں کے کئی مکانات، محل اور ایوان ہیں باہم متصل۔ اتنے وسیع کہ اگر ان (محملات و ایوانات کی) زمین کو سے پیمائش کی جائے تو شہر نہ سہی، ایک گاؤں کے برابر تو (رقبہ ہوگا) اتنے بڑے بڑے محل اس عالم میں کہ ان میں کوئی آدمی تھا ہی نہیں ٹوٹ مار

دکرنے والوں کے ہاتھوں، صاف اور دیران ہو گئے۔

کچھ کم قیمت لیکن سہاری سامان جیسے ایوان کے پرے مشامیان، سائبان، شطرنجیاں اور دوسرا فرش ان قیام گاہوں میں باقی رہ گیا تھا اچانک ایک رات، جس کی صبح کو راجہ ناہر سنگھ گرفتار ہوئے، اس مکان میں آگ لگ گئی۔ بپٹیں اٹھنے لگیں، بکڑی، پتھر، دیواریں سب جل گئیں۔ یہ عمارت مکان سے جانب مغرب اتنی قریب ہے کہ نما آدھی رات کو بجڑکتی ہوئی آگ کی روشنی چھت پر سے دیکھ رہا تھا اور دھوئیں کی گرمی میرے چہرے اور آنکھوں تک پہنچ رہی تھی کیونکہ اس وقت پھچا ڈھل رہا تھا۔ راکھ میرے اوپر آرہی تھی۔ ہاں بڑوسی کے گھر سے بلند ہونے والے، نئے سوغات کی حیثیت رکھتے ہیں پھر بڑوسی کے گھر کی آگ راکھ کیوں نہ برساتے۔

شاہ زادوں کی سرگزشت

راقم حالات کے قلم کی جتیش (اسی واقعے کا آخرے)، جو نیم مردہ چھوٹی کی رفتار کے برابر ہے (سست ہے)۔ (صفحہ کاغذ پر اس حالت) کی کیا دکان کر سکتی ہے کہ رنگا، اس کو دیکھ سکیں۔ شاہ زادوں کے متعلق اس سے زیادہ اوکھ نہیں کہا جاسکتا کہ بعض کو گولی مار دی گئی۔ (اس طرح) موت کے اڑدھے نے ان کو دھجک لیا۔ کچھ کی گردن میں پھانسی کا پھندہ ڈال دیا گیا (اس طرح) دس دہائی کشاکش سے ان کی روح ٹھٹھکر کر رہ گئی۔ چند امیر و دل تپتہ تپتہ ہیں اور بعض (عالم عزت میں) آوارہ و پریشان پھر رہے ہیں۔ کمزور و ضعیف بادشاہ پر مقدمہ چل رہا ہے۔

جاگیرداروں کا قتل

جمجمہ طب گڑھ اور فرخ نگر کے جاگیرداروں کو علیحدہ علیحدہ مختلف دلوں

میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اس طرح (ان لوگوں کو) ہلاک کیا کہ کوئی ہتھیار نہیں رکھتا کہ خون بہایا گیا۔

جنوری ۱۸۵۸ء

جنوری سنہ ۱۸۵۸ء کے آغاز میں ہندوؤں کو مزمان آزادی مل گیا اور (شہر میں) آباد ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ لوگ (ہندو) جہاں جہاں تھے شہر کی طرف چل پڑے۔ خانقاہ بریلو مسلمانوں کے گھروں میں (غالی پڑا ہونے کے سبب سے) سبزہ اس قدر آگ آ گیا ہے کہ درو دیوار سبزہ ہیں۔ ہر لمحہ سبزہ سر دیوار کی زبان سے یہ صدا آتی ہے کہ مسلمانوں کی جگہ بدستور (غالی ہے)۔

حکیم محمود خان کے متعلقین کی گرفتاری

شاید بد قسمت مغزوں کے کہنے سے حاکم شہر کو یہ خیال ہوا ہو گا کہ راجہ زین الدین سنگھ بہادر کے طبیعوں کا مکان مسلمانوں کی جائے پناہ اور جمع ہونے کی جگہ ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ (ان) سے چودہ گونگامہ ساز (مغزوں) میں سے ایک دو شخص اس محفل میں موجود بھی ہوں۔ اس خیال سے ۲ فروری کو منگل کے دن (حاکم شہر) کچھ سپاہیوں کے ساتھ اس جگہ آیا اور مکان کے بالکون کو ساتھ دوسرے نیک دل پناہ گزینوں کے ساتھ پانے ہمراہ لے گیا اگرچہ کچھ رات دن سب کو حوالات میں رکھا؛ لیکن پانچ لوگوں کی حورت کا بھی خیال تھا۔

۵ فروری

۵ فروری کو جمعہ کے دن حکیم محمود خان، حکیم مرتضیٰ خان اور ان کے بھتیجے عبدالحکیم خاں حوت حکیم کالے کو واپسی کی اجازت مل گئی ۱۲ فروری کو جمعہ کے دن چند دوسرے اشخاص ۱۳ فروری کو سینچر کے دن تین شخص اور واپس

آگئے (لیکن) نصف سے زیادہ حالات میں رہ گئے۔ یہ مصیبت جو پڑوس میں نازل ہوئی اور یہ ہنگامہ جو گلن میں برپا ہوا (اس کی وجہ سے) مجھ درویش غم زدہ کا دل بھی قائلو میں نہیں۔ اس کے باوجود کہ اس دارو گیر میں مجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ (بھی تک (یہ عالم ہے) کہ دن بھر متفکر رہتا ہوں اور رات میں آرام کی نیند نہیں سو پاتا ہوں۔

قصیدہ در مدح سر جان لارنس

فروری کے پر شوکت مہینے میں کہ اس زمانے سے ماہ فروردیں تک (جو موسم بہار کا پہلا مہینہ ہے) جس میں آفتاب کی رونق و روشنی بڑھ جاتی ہے سورج کو ابھی (درج حمل تک پہنچنے کے لئے) ایک مہینے کا سفر طے کرنا ہے۔ ماکم مہرباں، غور شید طلعت، ستارہ چشم سر جان لارنس صاحب چیت کشر بہادر کے آنے کی خبر مشہور ہوئی جو شکو میرا یہ طریقہ رہا ہے کہ جو حاکم ہندوستان خصوصاً اس شہر (دہلی) میں آئیں۔ ان کی مدح میں قصیدہ لکھا جائے۔ اس بنار پراس والا شکوہ (سر جان لارنس) کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا جو تہنیتِ فتح اور خیر مقدم نذر روزے مشتمل تھا اور ۱۹ فروری کو جمعہ کے دن بذر یعد ڈاک بھیجا۔

۲۰ فروری۔ خبر فتح مکہ

۲۰ فروری کو شام کے وقت ۲۱ دیو آواز، ہنگ آہنگ توپوں کی آواز آئی اور انوار کی صبح کو مشہر مکہ کی فتح کی خوشخبری اس تفصیل کے ساتھ سننے میں آئی کہ ۱۶ فروری کو آسمان سروری کے اختر تابندہ، سپہ سالار نامور کمانڈر انچیف بہادر نے سیاہ رو، جنگ جو (باغیوں) پر اس طرح چیلہ کیا کہ آسمان کے۔ سپہ سالار (مرکز) نے سلامت دست و بازو کی اتنی دعا تیں دیں اور اس قدر تعریف کی

کہ اس کے ہونٹوں پر بجائے پڑ گئے اور زبان تنک گئی۔
 دنیا کو آبادی کا مشرودہ اور اہل دنیا کو لویہ آنا دی! کہ آنا داد اور نیک ذات
 لوگوں (انگریزوں) کی آرزو پوری ہو گئی اور مجھے اور ہر ذات لوگوں کا دور
 دورہ وہاں بھی ختم ہو گیا سچے سچے میں آیا کہ توپوں کی گرج (اور شہنائیوں
 کے نغمے) صرف (حصول طاقت، فتح نصیب) فوج کے بہادر
 اس جنگ کے دوران میں شہر پر قابض نہیں ہوئے (بلکہ) دلیروں کے
 طرح دشمنوں سے لڑنے کے لئے دوپڑے (دشمنوں کو) زخمی اور قتل کرنے کے
 بعد (اپنے) پٹاؤ کی طرف لوٹ آئے۔

۲۴ فروری - آمد حیف کشنر

۲۴ فروری کو بدھ کے دن ایک پہر دن چڑھے سے
 بوستان دارما آزاد مسرد
 آسمان جاہ راتا بندہ ماہ

مہاک وقت میں باغ انصاف کے سرو آزاد آسمان
 رفعت کے ماہ تابندہ۔

فرخ طلعت، فرخندہ سیرت، ستارہ چشم، حیف کشنر بہادر نے اپنے توسن
 کے سون کے نشانات سے دہلی کی سرزمین کو آسمان کی طرف ستارہ زار بنانا
 اور تیرہ توپوں کی (سلاخی کی) آواز سے خستہ دلوں کو مرہم مہر دیمت کی بھارتی۔

درکابد شہر روان باز آمد

فرمانفر مالی مشر نشان باز آمد

زب شادی خوش دلی کہ دما شہر

گوئی کہ مگشاہ جہاں باز آمد

حاکم شاہ نشان (کیا، گئے کہ شہر کے (مروہ) جسم میں

روح واپس آگئی۔ شہر میں مسرت کی ایسی (پھر)
دور لگئی ہے جیسے (شہنشاہ) خاں جہاں واپس آئے ہوں۔

۲۷، ضروری

۲۷، ضروری کو جب سینچر کا دن ختم ہوا اور رات آئی۔ رات کے تین
پہر گزر گئے۔ (اس وقت) مہنگلوں کے دل کا دھواں چاند پر اس طرح بھجا
گیا کہ دیکھنے والے بے اختیار چلا اٹھے کہ چاند گہن میں آ گیا۔ اسی سینچر کو حکم دو
باش ختم ہو گیا۔ انصاف چاہنے والے اور پریشان حال لوگوں کو حاضر ہونے
کی اجازت اور خواہش مندوں کو پناہ دے دی گئی۔

بے شمار لوگوں کو پھانسی

اس شہر میں قید خانہ شہر سے باہر ہے اور حوالات اندون شہر۔ اسے
دو دن میں بے شمار لوگوں کو بھردیا گیا ہے۔ (ان محدود مقامات میں کثرت
قید کو دیکھ کر) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی میں آدمی سمایا جا رہا ہے۔ ان دو دنوں
قید خانوں کے جن قیدیوں کو مختلف دنوں میں پھانسی دے دی گئی ہے۔ ان
تعداد فرشتہ موت ہی بے منتظر ہے شہر میں ایک ہزار سے زیادہ مسلمان بنیں
پاؤ گئے۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں جو لوگ شہر سے نکل کر چلے گئے ہیں
ان میں سے کچھ لوگ اس قدر درد نکل گئے نہیں گویا وہ اس سرزمین (دہلی)
کے باشندے تھے ہی نہیں۔ بہت سے مالی مرتبہ لوگ شہر کے ارد گرد دودھ چار
چار کوس پر ٹیلوں، گڑھوں، پھپھروں کے مکانات میں اپنے زعیب کی طرح
آنکھیں بند کئے ہوئے پڑے ہیں۔ اس دیرانہ نشیں گروہ میں یا تو وہ لوگ
ہیں جو شہر میں رہنے کے خواہش مند ہیں یا گرفتار شدہ لوگوں کے رشتہ ہیں یا
خیرات خوار یعنی بدشمار ہیں لوگوں کو بدخواستوں میں رہائی، آبادی اور

اجر لئے پنشن کے علاوہ اور کوئی مصنفین، نہیں پاؤ گے۔ داد خواہوں کی دو تین ہزار درخواستیں عدالت میں پہنچ چکی ہیں۔ یہ انصاف طلب چشم براہ اور گوش برآواز ہیں کہ کیا صفے اور دیکھنے میں آتا ہے۔

۸ مارچ

میں بھی اس نیا زما سے اور سناکش نامے کے جواب کا منتظر ہوں جس کو میں نے بذریعہ ڈاک بھیجا تھا۔ مختلف خیالات پریشانہ کے سبب سے حاکم (شہر) کی جلسے قیام پر جلسے اور ملاقات کرنے کی کوئی صورت نہیں نکلی ہے مختصر یہ کہ (ہر اعتبار سے) ایسی مصیبتیں ہیں گویا ہر طرف کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ اگر باہر نکلو گے تو راستے میں (پچھے ہٹے) دیکھو گے۔ اگر گھر ہی (میں بیٹھے رہو گے) تو معلوم ہو گا کہ کپڑوں میں جھپے ہوئے ہیں (کسی طرح سکون نہیں ہے) ابھی تک صبر بے تابی پر غالب تھا کہ ۱۸ مارچ کو پیر کے دن وہ خط ایک تحریر کے ساتھ میرے پاس واپس آ گیا۔ خط کی پیشانی حاکم دانش آموز کے اس فرمان سے منور تھی کہ خط فریسنده کو واپس کر دیا جائے تاکہ وہ حاکم شہر کے توسط سے ہمارے پاس بھیجے۔ سب نے کہا اور میں نے بھی سوچا کہ یہ پر فائدہ جواب امید افزا علامت ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میری (گزارشات) منظور ہو جائیں گی وہ خط جس پر منظور منتظر نامہ سب عمارت کے اعضاء کے ساتھ سرور عادل "رعایا پرور" دانش مند، چارلس سائڈس صاحب چیف کمشنر بہاد کے حضور میں بھیجا اور خط خاص طور پر نامور موصوف (چارلس سائڈس) کے نام منسلک کر دیا جو خواہشی دیرینہ یعنی اجر لئے پنشن سے متعلق تھا۔

۷ مارچ

۷ مارچ کو بدھ کے دن مزاں روا کے حضور سے پہلی خواہش کے بارے

یہ حکم صادر ہوا کہ یہ خط جس میں تہذیب کے سوا کچھ نہیں ہے اس کے سمجھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے بھی سوچا کہ ایسے پر آشوب حالات میں مہر و محبت اور مسرت و انبساط کی کیا گنجائش۔ میں تو بندہ شکم بڑوں۔ مجھ کو تو بدنی چاہیئے۔ دیکھوں اس دوسری خواہش کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے۔

۱۸ مارچ - فتح لکھنؤ

۱۸ مارچ کو جمعہ کے دن شام کے وقت روح کو توانائی بخشنے والی آواز توپ آسمان کے نیلے گنبد میں گونج اٹھی (جس سے لکھنؤ کا فتح ہونا اور اس شہر میں کینہ خواہ انگریز فوج کا حُب دل خواہ پھیل جانا معلوم ہوا۔ اس شہر میں قلعہ، فصیل، دروازہ کچھ نہیں ہے۔ یقیناً وہاں کے باغیوں کی فوج کی دیر اس طرف کے بہادروں (انگریزوں) کا راستہ روکے ہوئے ہوگی۔ جب وہ کمزور دلاور بہادروں کی کوشش کی آندھی سے گڑھی ہوگی تو بالیقین سواروں اور پیادوں کے چلنے سے ہر راستے سے گرد و غبار بلند ہوا ہوگا ہاں خدا اپنے فضل سے جس کو بادشاہت عطا کر تلبہ، اس کو فتح کرنے کی طاقت اور شان و شوکت بھی عطا کر تلبہ۔ اسی بنا پر ہوش فتنہ زمان رواؤں کی نافرمانی کر تلبہ، وہ اس قابل ہے کہ اس کے سر پر جوتے لگیں۔ محکم کا حاکم سے لڑنا (استالی) پر ہاتھ مارنا (بچنے آپ کو تباہ کرنا) ہے دنیا والوں کے لئے مناسب ہے کہ جب لوگوں کو خدا نے خوش بخشی عطا کی ہے ان کے سامنے سر جھکا دیں اور فرمانرواؤں کے حکم کی تعمیل کو خدا کے حکم کی تعمیل سمجھیں۔ جب ہم کو یہ معلوم ہو گیا کہ خوش نصیبی حکومت اور طاقت کس کی بخشی ہوئی ہے تو پھر سرکشی اور بیزاری کیوں ہے۔ نغمہ طراز شیراز (سعدی) نے اس بات کو کیسے اچھے انداز سے ادا کیا ہے۔

چہ کند بندہ کہ گرن نہ بند فرمان را
چکند گوئی کہ تن درند بد چو گان را
غلام (آقا) کے حکم کے سامنے سر نہ بیا جھکائے گا، تو کیا اگر کیا
گنبد چو گان کی اطاعت کے علاوہ کر بھی کیا سکتی ہے

۲۲ مارچ سے مجھ دہلانے کے دل میں یہ بات کھٹک رہی ہے کہ دنیا میں
فرور دیں کا مہینہ اور فرورد کا دن بھی تھا اور وہ روز جہاں افرورد (فرورد) نہیں
دو چار تاریخوں میں ہوتا تھا۔ اس سال شاید یہ شہر مردوں کا مسکن ہے کہ بہار کی
آمد آمد پر لغو ہائے مسرت سننے میں نہیں آتے ہیں۔ کوئی نہیں کہتا کہ: سال
کے سال درازہ گانہ میں سے کونسا سال ہے اور رات دن کے برابر ہونے کی
ساعت کب آئے گی۔ اگر منجم مر گئے ہیں اور دن کے بادشاہ (آفتاب) کے سفر
کا روزنامہ ستر ہزار پیش گوئی (ستارے) سے خالی رہ گیا تو یہ سمجھو کہ چند جھوٹ بولنے
والے کم ہو گئے اور یہ فرض کر لو کہ چند جھوٹی باتیں سنی ہی نہیں، آفتاب برج
حل میں قیام (توقیل) کو بھولا نہیں ہے کہ سبزہ نہ آگے اور بھول نہ کھیلیں
اصول آفرینش بدلتے نہیں ہیں۔ آسمان مقررہ اصول گردش کے خلاف عمل نہیں
کر سکتا۔

میں باخ پر نہیں، اپنے اوپر آنسو بہا رہا ہوں مجھے موسم بہار کی کوئی شکایت
نہیں ہے۔ اپنی بد قسمتی کا شکوہ کر رہا ہوں۔

جہاں از گل دلالہ پر بوی درنگ
من و گوشت و انہی زیر سنگ
بہاراں و من ماند ہے برگ و ساز
در خانہ از بے لوائے سراز

دنیا لالہ کے پھولوں سے رنگین اور گلاب کے پھولوں کی خوشبو
سے محظوظ ہے (لیکن) میں ایک گوشے میں مجبور رہے مرسا مان

بیٹھا ہوا ہوں، یہاں کا موسم ہے اور میں بالکل بے سرو
سامان ہوں، مفلسی کے سبب سے گھر کا دروازہ بند ہے۔

روانگی محمود خان

میں روتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ زماذ بہت بے پروا ہے، میں زلزلے نشیں غم
و آلام اگر سبزہ و گل کو نہیں دیکھوں گا اور دماغ کو پھولوں کی خوشبو سے معطر نہیں
کروں گا تو بہار میں کیا کئی آجائے گی اور ہوا سے کون تاوان لے گا ؟
اپریل کے چھینے میں جس میں دو ٹکٹ ماہ فردین کے اور ایک ٹکٹ ماہ
اردی کا ہے، حکیم محمود خان کے ساتھ جو لوگ قید خانے میں باقی تھے، رہا ہو گئے
ہر ایک نے اپنا راستہ لیا وہ ناز پروردہ، صاف طینت (حکیم محمود خان) سائے
رشتے داروں، بیوی بچوں اور متعلقین کے ساتھ پٹیلے کی طرف چلا گیا کہتے ہیں
ابھی تک وہ کرنال میں مقیم ہیں معلوم نہیں آئندہ کس لئے کیا سوچا ہے۔

فتح مراد آباد

مٹی کے خرچ میں کالوں کو یہ خبر سننے کا خضر حاصل ہوا کہ پیادہ کینہ خواہ کے
بہادروں نے مراد آباد کو فتح کر لیا جو بداندیش (بانیوں) کی گزرگاہ ستھا اور اس
شہر کو انصاف سے آراستہ کرنے کے لئے عالی نسب سرچشمہ و معلم و دانش، نواب یوسف
علی خان بہادر کے حوالہ کر دیا۔ آج کل (نواب یوسف علی خان) جو دنیا کو فتح کرنے
اور دنیا پر حکومت کرنے کے اہل ہیں، اس علاقے پر تعمیل حکم کے طور پر فرما سزاوائی
کرتے ہیں (اور مجھ کو) امید ہے کہ ہمیشہ فرماں برداری کرتے رہیں گے۔

فتح بریلی

اس کے علاوہ کہتے ہیں کہ کوہ شنگاٹ اور اثر دھانکار فوج نے جیب (بریلی)

درواد (پارکے) اس علاقے پر پیرش کی تو برہمنی کے گناہگار (باجیوں) کو اس طرح نکال باہر کیا۔ جیسے طاقت ور موہیں جس دغا شک کو کناہے پر پھینک دیتی ہیں۔ اس صورتحال کو (دیکھتے ہوئے) توقع ہے کہ جو گراں جان (باجی) ادھر اُدھر باقی رہ گئے ہیں۔ رشتہوں، گھاؤں میں لوگوں کو پریشان کرتے ہیں اور راستہ چلنے والوں کو ستاتے ہیں ان کا دور دورہ بھی جلد ختم ہو جائے گا اور سارا ملک سالکانِ عادل (انگریز) کے پرچم کے زیرِ سایہ آ جائے گا۔

۱۳ جون۔ احوال بہادر جنگ خان

۱۳ جون کو اتوار کے دن شام کے وقت ملک شہر نے بہادر جنگ خان کو اپنے پاس بلایا جو قلعہ میں نظر بند تھے وہ بڑی اُمیدوں کے ساتھ گئے۔ جہاں بخشی اور ایک ہزار ماہانہ وظیفہ مقرر کئے جانے کی خوشخبری سنائی گئی اور حکم ہوا کہ لاہور کی طرف چلے جائیں۔ اس کے بعد آزادی کی زندگی بسر ہوگی اور اس مشہور لاہور میں رہنا ہوگا۔ بے شک ان حالات میں مناسب یہی ہے کہ وہ (بہادر جنگ خان) جاہ و دولت کے غم و افسوس سے آزاد ہو جائیں اور اس آزادی پر مسرور و مطمئن ہوں۔

فتح گو الیاء

دن کا شہنشاہ (آفتاب) جس کا سر روزانہ نیزے پر گھمایا جاتا ہے اسی افقِ مشرق سے بہ قدر یک نیزہ بلند نہیں ہوا تھا کہ ماہِ جون کے گزرنے ہوئے دنوں کی تعداد کے برابر عدد کی طرح گر جنے والی توپوں کی آواز بلند ہو گئی۔ (۲۱) ضربِ توپ سے مراد ہے، جس نے دوستوں کے دل کو مسرت و نشاط دہانی سے سمون کر دیا اور آگ سے زیادہ جلانے والی (حُم کی) راکھ و شبنوں کے سراؤں جیسے پھاڑاں دیں۔ گوالیار کا شہر فتح ہو جانے اور اس سنگینی قلعہ کے ہاتھ

آجانے کی خوشخبری جو زمین کا ہلکے گوشہ اور پہاڑ کا تختہ ہلکے ہے، خدا کے دربار سے سرکشوں کی موت کا پروانہ لائی (اس مشورہ پر مسرت نے) ملکوں اور فرما سے برداروں کو آندوں کے چراغ جل اٹھنے (آرزوئیں پوری ہو جانے) کی بشارت دی۔ یہ داستان یوں ہے کہ باغیوں نے گوالیار پر قبضہ کر لیا۔ فرماں رولائے گوالیا ہمارا جہ جیلہی راؤ حکومت اور شہر دونوں کو چھوڑ کر آگے چلے گئے اور انگریزوں سے مدد چاہی (انگریزوں سے) امدادی فوج لے کر اپنے وطن کی طرف گئے اور فتح حاصل کی (باغیوں نے) بھاگ بھاگ ہر طرف سے گوالیار کا رخ کیا (ستار) یہاں ایسی شکست فاش ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان گمراہوں کا انجام یہ ہو گا کہ بد حالی و پشیمانی کے ساتھ ادھر ادھر لوٹ مار کرتے پھریں گے اور آخر کار جگہ جگہ ذلت و خواری کے ساتھ مائے جاہل گئے ان کے سوا نورد و گھوڑوں کو بے آب و گیاہ میدانوں میں پر پڑا ہوا (مردہ) دیکھو گے اور اس گروہ کے ساز و سامان کو گرہا جوں میں بکھرا ہوا پاؤ گے پھر منہستان خس و خوار (ظلم و ستم) سے ایسا پاک ہو جائے گا کہ جنگل کا ہر گوشہ باغ کی طرح سرسبز ہو گا اور ہر رہ گزر بازار کی طرح پر رونق نظر آئے گی۔

راتم المروت کی زندگی کے تریسٹھ سال گزر چکے ہیں۔ ان طرح طرح کے روح فرسائوں کے (سبب) سے ظاہر ہے کہ ابذلنے سے زیادہ فرصت (عمر) کی توقع بے جا ہے مجبوراً سحر و نگار شیراز (سعدی) رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار کو دہراتا ہوں اور جس طرح ایک عزم نصیب وہ سرے غمزہ شخص سے نصیحت حاصل کرتا ہے ان اشعار (کو پڑھ کر) اگر دل کو خوش نہیں کر سکتا ہوں تو کم سے کم قید رنج و غم سے آزاد تو کر ہی لوں گا۔

درینف کہ بی مایوسی روزگار
بروید گل و بشکند لڑ پہلار
بسی تیر و دیماہ وادی بہشت

بیاد کہ ما خاک ہاشیم و خشت

اضحیٰ ! ہمارے بغیر اس دنیا میں بار بار ہا ہا رہیں آئیں
گی اور سچول کھلیں گے۔ تیرے اور ار دہی ہشت
کے مہینے بار بار آئیں گے۔ جبکہ ہم (قبر میں) خاک
ہو چکے ہوں گے۔

فی الحقیقت سچی بات کو چھپانا اچھے لوگوں کا طریقہ نہیں ہے میں خیم
مسلمان مذہبی پابند لوگوں سے آزاد ہوں، اور بدنامی و رسوائی کے رنج سے
بے نیاز۔ چیشہ سے رات میں صرف ولایتی شراب پینے کی عادت تھی۔ ولایتی
شراب نہیں ملتی تھی تو نیند نہیں آتی تھی۔ آج کل جبکہ انگریزی شراب
شہر میں بہت مہنگی ہے اور میں بالکل مفلس ہوں۔ اگر غذا دوست،
خدا شناس، خیاض، دریا دل، ہمیش داس، ویسی شراب قند جو رنگ میرے
ولایتی شراب کے برابر اور لو میں اس سے بڑھ کر ہے۔ بیچ کر آتش دل کو
سرد کرتے تو میں زندہ نہیں رہتا۔ اسی عالم جگہ تشنگی میں مر جاتا ہے

از دیر و لم دایہ زہر در می جُست

از پادہ ناب یکدو سا عمری جُست

فرزاد مہیں داس خنثید بمن

آئی کہ برای خود مسکندر می جُست

حوصے دل چاہتا تھا کہ کس طرح میری آرزو پوری ہو جائے

(آرزو یہ تھی کہ شراب ناب کے ایک دو سا عمر مل جائے)

دانش مند مہیش داس نے مجھ کو وہ آب (حیات) بخشی

دیا۔ جس کو سکندر نے اپنے لئے ڈھونڈا تھا۔

یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس نیکی پسند شخص (جیش داس)

نے (شہر میں) مسلمانوں کی آباد کاری کے متعلق کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ چونکہ

خدا کی مرضی نہیں تھی۔ کوشش کارگر نہیں ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ (شہر میں) ہندوؤں کا آزادی کے ساتھ رہنا مہرمان ماکوں کی محنت اور مہربانی کا نتیجہ ہے بہر حال اس نیکی پسند بھی خواہ (میش واس) کا اس انتظام میں دخل پہلے۔ قصہ مفخر خوش نصیب شخص ہے۔ لوگوں کے ساتھ نیکی کرتا ہے زندگی عیش و مسرت کے ساتھ گزارتا ہے اگرچہ مجھ سے بہت پرانی شناسائی نہیں ہے اتفاقاً کہیں ملاقات اور بات چیت ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی کوئی تحفہ بھیج کر مجھ کو ممنون کرتا ہے۔

ہندو شاگردوں اور دوستوں کی امداد کا اعتراف

میرے دوسرے متعلقین اور شاگردوں میں سے ہر اس شخص، جو ایک نیک نام نوجوان اور تعلقات کا بہت خیال رکھنے والا ہے (براہر آتا ہے) اور میرا غم غلط کرتا ہے۔ اس نصف آباد نصف ویران شہر کے لوگوں میں سے مالی نسب شیوہی رام برہمن جو ایک عقل مند نوجوان ہے اور مجھ کو بچے کی طرح عزیز ہے مجھ و دیش غم زدہ کو بہت کم تنہا چھوڑتا ہے فراہم داری اور کار سازی کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا رز کا بال مکند جو ایک پرہیزگار اور خوش اخلاق نوجوان ہے اپنے والد کے طرح تعمیل حکم میں مستعد اور غم گساروں میں بچتا ہے۔

دور دراز کے دوستوں میں سے (ایک دوست) آسمان محبت کے اہ کامل شیوا بیان ہر گوپال تعلقہ (سچی ہے) جو میرے پرانے مونس و ہمد ہیں اور اس بنا پر کہ مجھ کو اپنا استاد کہتے ہیں۔ ان کا کلام ساری فدا داد خوبیوں کے ساتھ میرے لئے سرمایہ نانہ ہے مختصر یہ کہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ مہر تاپا محبت و اخلاص شاگرد سے ان کو فروغ (شہرت) حاصل ہے اور ان کے دم سے خارجی کے ہنگامے گرم بہتے ہیں انتہائے محبت سے میں نے ان کو اپنا جزو روح سمجھ لیا ہے اور "مرزا تندر" خطاب دیا ہے۔ انہوں نے میرے پاس سے ایک ہنڈی میرے پاس بھیجی۔

نیز غزل اور خط برابر سمجھتے بہتے ہیں۔

یہ باتیں جن کا لکھنا اور سن نہیں تھا، صرف اس لئے لکھیں کہ ان لوگوں کی فیاضی اور محنت کا شکریہ ادا ہو جائے نیز اس لئے بھی لکھیں کہ جب یہ داستان دوستوں کے ہاتھوں میں آئے تو وہ مجھ لیں کہ فہرست ملازم سے خالی ہے راتوں کو ان لوگوں کے گھر چراغ سے محروم رہتے ہیں اور دن میں دیواروں کے روزن دھو بیٹھتے۔ غالب جس کے شہر میں ہزاروں دوست تھے۔ ہر گھر میں شناسا اور واقف کار موجود تھے۔ اس تہنائی میں تلک کے سوا کوئی اس کا ہم زبان اور دلپسند کے علاوہ کوئی ساتھی نہیں ہے۔

اکنوں منہم کہ رنگ بردیم نیز سد

تارخ بخون دیدہ نشویم ہزار بار

وہ چیم زور دو دریغ است جان دل

وہ بہترم ز قارۂ وفار است بلو و تار

اب میرے چہرے پر اس وقت تک آب درنگ نہیں

آٹھ ہے جب تک کہ ہزار بار اشک دھوئے چہرے

کو تر دکروں میرے جسم میں غم و افسوس جان و دل

نہ گئے ہیں اور میرے بستر کا تانا بانا کانٹوں سے

تیار ہوا ہے۔

گھر کی تباہی

اگر شہر میں یہ چاروں شخص نہ ہوتے تو کوئی شخص میری بے کسی کا گواہ بھی نہ ہوتا، اگر دشمن، روزگار پر رشک آتا ہے کہ اس کوٹ مار میں جبکہ شہر کے کسی گھر میں مٹی بھی نہیں بچی۔ اگرچہ میرا گھر لوٹ مار کرنے والوں کی دراز دستی سے محفوظ رہا، لیکن میں قسم کھا سکتا ہوں کہ بستر اور پہننے کے

کپڑوں کے علاوہ گھر میں کچھ نہیں رہا۔ اس عقیدہ دشوار کا حل اور اس دروغ نمائش کی حقیقت یہ ہے کہ جس وقت کالوں (باغیوں) نے شہر پر قبضہ کیا۔ بیگمنے مجھ سے کہے بغیر قیمتی چیزیں زور و میزہ جو کچھ ستاخفہ طور پر کالے صاحب پرزادہ کے یہاں بھیج دیا۔ وہاں ہتھ خانے میں محفوظ کر دیا گیا اور دروازہ مٹی سے پات دیا گیا۔

جب فاتح انگریزوں نے شہر کو فتح کیا اور سپاہیوں کو لوٹ مار کا حکم لیا۔ تب بیگمنے یہ ملاز مجھ سے کہا۔ وقت نکل چکا تھا وہاں تک جانے اور سامان لانے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ میں خاموش ہو گیا اور دل کو سمجھالیا کہ یہ چیزیں جانے والی ہی تھیں۔ اچھا ہوا کہ میرے گھر سے نہیں گئیں

تنگ دستی و مجبوری

اب یہ جولائی کا پندرہواں مہینہ ہے۔ قدیم پنشن جو سرکار انگریزی سے ملتی تھی اس کے ملنے کا کوئی ذریعہ نہیں نکلا۔ بستر اور کپڑے بیچ بیچ کر زندگی گزار رہا ہوں گویا دوسرے لوگ روٹی کھاتے ہیں۔ میں کپڑے کھاتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ جب کپڑے سب بیچ کر کھالوں گا، عالم برہنگی میں بھوک سے مر جاؤں گا۔

اس تیامت میں پرانے فکروں میں سے دو تین لوگ میرے پاس سے نہیں گئے ان کی بھی ہمدوش کرنا ہے القاصد کی بات تو یہ ہے کہ آدمی آدمی کے بغیر نہیں سکتا۔ لوگ کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اس گروہ ملازمین کے علاوہ دوسرے مزدور تھند جو ہمیشہ سے مجھ سے کچھ نہ کچھ نانہہ اسٹالٹ کے مادی ہیں۔ اس بڑے وقت میں بھی اپنی روح فرسا آواز (سوال) سے مرعہ کی صداٹھے بے ہنگام سے زیادہ تکلیف پہنچاتے ہیں۔ اب جبکہ جسمانی تکلیفوں کے دباؤ اور روحانی اذیتوں کی گڑبختی نے

جسم و جان کو تباہ کر دیا ہے۔ یہ ایک دل میں خیال آیا کہ اس کھلونے کو آرام سے کرنے میں جس کا نام تعصیف ہے، کب تک مشغول رہا جاسکتا ہے یقیناً اس کش مکش کا انجام یا قوت موت ہے یا سبیک مانگنا پہلی صورت میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا کہ یہ داستان ہمیشہ کے لئے انجام و اختتام سے محروم ہے اور پڑھنے والوں کے دلوں کو افسردہ کرے۔

دوسری صورت میں یہ بات ظاہر ہے کہ اس ساری داستان میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ فلاں گلی سے سربازا ردھت کار دیا گیا اور فلاں دیوار سے پر کچھ مل گیا۔ پھر یہ باتیں کب تک بیان کی جاسکتی ہیں اور اپنے آپ کو کہاں تک رسوا کیا جاسکتا ہے۔ باقی پشن اگر مل گئی، تب سب آئینہ دل سے رنگِ عن صاف نہیں ہو سکے گا۔ قرض ادا نہیں ہوگا اگر نہیں ملے اس صورت میں شیشہ پتھر سے چور چور ہو جائے گا۔ (تباہی یقینی ہے) اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں چور کچھ بیاں (دہلی) کی آب و ہوا معیبت زدہ لوگوں کو سازگار نہیں آتی ہے۔ یقیناً شہر سے بھاگنا ہوگا اور کسی دوسرے شہر میں رہنا ہوگا۔

تفصیل و قانع دستہ

نئی سال گوشتہ سے لے کر جولائی ۱۵۵۷ء تک کی روداد میں نے لکھی ہے۔ یکم اگست سے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔ کاش میری ابن تین خواہشوں میں خفایا خلعت اور پشن کے اجراء کا حکم شہنشاہ فیروز بہت سے آجائے جن کے متعلق میں نے اس تحریر میں بھی کچھ لکھا ہے۔ میری آنکھیں اور میرا دل انہیں کی طرف لگا ہوا ہے وہ شہنشاہ کہ چاند جس کے سر کا تاج ہے، آسمان جس کا تخت ہے جہد نشان، مزیدوں، فر کاؤس مرتبہ منہر شکوہ، سکند و حشم، وہ شہنشاہ کہ شاہِ روم سے بات کے لئے اس کا شکر گزار ہے کہ اس کے تخت و تاج کی عزت رہ گئی

فرماں روانے روکس کا دل اس کی لشکر کشی کے خوف سے روہیم ہے آفتاب
 اس خیال سے کہ (یہ) جہاں سوزی اس کی ناراضی کا سبب ہے، اگر ڈرنا نہیں ہے
 تو سچہ وہ کیوں ہر لمحہ کا پتلا رہتا ہے اور راہ کامل اس اندیشے سے کہ دنیا کو منور
 کرنے ہیں اس کی برابری کا احتمال ہے اگر اپنی گناہ کی معافی نہیں چاہتا ہے تو
 ہر کیوں ہر رات خوف سے گھٹتا رہتا ہے۔

خداوند تیغ و نیکن و نشان

شہنشاہ مشاہد و نشان

خردمند فرخ رُخ نیک خوئی

زلو شیرداں ہمدہ در داد گوئی

روخشاں و رخشی کہ جہیز داشت

ندانی کہ از بہر حب لہیز داشت

بدن داشت تا اندرین روزگار

سپار و بدی نامور شہر یار

زخیر و ترنج زرد ہفت گنج

رہ آور و شاہ است دست پنج

خود آں تخت کیش باو بروی بدش

بہر پیش کش کردہ "فرخ سرودش"

نہ جہی کہ در کوہ از مغز سنگ

بر آید ہی گو ہر رنگ رنگ

بود مہر راجشہم بر افشہر شش

وگر نہ چہ کار است باگو ہر شش

گر آہنگ گو ہر نشان کند

چنان در فشاندن وانی کند

کہ آں کو ہر آرد اگر در شمار
شود سودہ انگشت گوہر شمار

زیم سپاہش کہ گاہ نبرد

بر آرد ز دریا و کبیلہ گمرد

بکھ اثر واد و بدریا ہنگام

و دہماں در آب و درند سرینگ

دور و مشکوہ نمایان او

خدیوان گیش گمدا یان او

ہا افز و شش و شش ہے درین

در نشتہ خورد شید و ہارندہ بین

ہر گشت نبشش خود و ر لواز

بفر تاب وانش خرد مند ساز

جیشش شگرفت و بدانش رسا

جہاں دار فرزادہ و گنتور یا ؟

کہ پروان پاکش بگمدا و باد

ارنگش دریں بزم بسیار باد

(ترجمہ)

وہ مالک تیغ و نگین و علم ہے۔ وہ شہنشاہ سلطنتش

اور بادشاہ ساز ہے۔

صاحب دانش، فرخ طلعت اور نیک شخص ہے۔ اس کا مرتبہ انصاف

میں تو شیر و ان سے بلند تر ہے۔ جیشیہ کے پاس جو درختاں علم تھا وہ

اس لئے اس کو حفاظت سے رکھتا تھا کہ ملکہ نامور کے سپرد کرے۔

خسر کی طرف سے ترنج ذرا اور اس کے ساتوں خزانے بغیر رحمت

اٹھائے ہوئے ملکہ کو بطور تحفہ ملے۔

وہ تخت (سلیمان) جس کو ہوا اپنے کاندھوں پر لے جاتی تھی،
فرشتہ معین نے ملکہ کے سامنے بطور پیش کش پیش کیلئے
تم نہیں دیکھتے ہو کہ پہاڑوں پر پتھروں کے جگرے گوہر رنگا
ننگ برآمد ہوتے ہیں۔ سورج کو اس کے تاج کا خیال رہتا ہے
وہ اسے موتیوں سے کیا کام۔

اگر وہ (ملکہ وکٹوریہ) موقی ٹٹانے کا ارادہ کریں اور لٹائیں
تو کثرت بخشش ہے۔ حالت ہوگی کہ اگر کوئی شخص اسے
موتیوں کو شمار کرنا چاہے گا تو شمار کرتے کرتے اس کی انگلیاں
گھس جائیں گی۔

اس کی خوج کے خوف سے جو لڑائی کے وقت دریاؤں او
پہاڑوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ پہاڑوں میں اڑھے اور دریاؤں
میں ہنگ سرچک کر مر جائیں گے۔

اس کی شان و شوکت کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے بادشاہ
اس کے دور کے گدا ہیں۔

اس کی ضیا بخش اور کرم بے دریغ کا یہ فیض ہے کہ یہ سولج
روشن ہے اور بادل میں برسنے کی صلاحیت ہے۔

وہ کرم اور فیاضی سے اہل علم و دانش کو نوازیں ہیں اور ان
کی دانشمندی کی برکت سے دوسرے لوگ صاحبِ خرد ہوجاتے ہیں۔
ان کی سخاوت حیرت آفریں ہے اور ان کی مقلد سا۔ ان کا
نام ملکہ عالم وکٹوریہ ہے۔

خدائے پاک ان کا نگہبان ہے خدا کرے اس مفلح
ہیں ان کا قیام دیر تک ہے۔

اگر ملکہ عالم کی بخشش سے میں کچھ حاصل کر لوں گا تو دنیا
سے ماکام نہیں جاؤں گا۔

چوں نگارش بدیں نشان پوست
تن ز دم ، داستان نئی خواہم
جب بات یہاں تک آپہنچی تو میں خاموش ہو گیا
میں داستان کہنا نہیں چاہتا ہوں ۔

مکمل ہونے کے بعد اس کتاب کا نام دستنور رکھا گیا : یہ کتاب لوگوں
کو دے گئی اور ادھر ادھر بھی گئی تاکہ صاحبانِ علم و دانش کی روح کو تسکین
بخشنے۔ اور انشاء پر دانا انداز نگارش پر فریفتہ ہو جائیں۔ امید ہے کہ
یہ مجموعہ دانش و دستنور الفاضل پسند لوگوں کے ہاتھوں میں گلدستہ پر رنگ
دلو ہو گا۔ اور شیطانِ فطرت لوگوں کی نگاہوں میں آتشیں گیند مین! ہے

ذیشان کہ ہمیشہ در روانی مایم
سرچشمہ راز آسمانی مایم
لغنی ز رستایر بود نامہ ما
ساسان ششم بہ کاروانی مایم

جب بات یہاں تک رواں رہتی ہے اس کی وجہ یہ ہے
کہ ہم راز ہائے آسمانی کا سرچشمہ ہیں۔ یہ کتاب دستاویزی
کا ایک حصہ ہے اس کاروانی کے لحاظ سے (گویا) ہم ساسان
ششم ہیں۔

تمام شد

اس کتاب کو بغیر مہتمم مفید خلائق کے کوئی صاحب چھاپنے
کا ارادہ نہ کریں۔ فقط :

قطعہ تایرخ

آغاز کتاب از میرزا احاتم علم بیگی مہر مخلص سلمہ اللہ تعالیٰ

اسد اللہ منان غالب، مہتر
حبذا زورستم چہ دستبنو
نامہ خود سال خویش را نشان
بدر بیناستم چہ دستبنو

۵۷ ع ۱۸

قطعہ تایرخ

انجام کتاب از میرزا تقی سلمہ اللہ تعالیٰ

کتابی زورستم غالب کہ آن را
بہان و دل جہان گشت طالب
نوشتم تقی سال امتنا مش
بیا بنگو چہ دستبنو غالب

۵۸ ع ۱۸

لا ب دانش فلط و نفع عبادت معلوم
دردیک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ نسی
دیر و حیرم آئینہ متحوار و متنا
وامانہ گی شوق تراشے ہے پناہیں
تو تہ اور آرائشیں حنم کا نس
یہیں، اور اندیشہ ہائے دور و دراز
(غالبیہ)